تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

مئی ۲۰۲۱ء

جلد ۱

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

شمارہ ۷

لیتفقهوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

لیتفقهوا فی الدین

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین

ماہنامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

حافظ حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- حافظ سید اسامہ علی
- استاذ ابرار حسین
- استاذ عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

فہرست

اداریہ ۴

درسِ قرآن .... حافظ حماد احمد ترک ۱۰

درسِ حدیث .... ابن عباس ۱۲

حضرت شیخ الاسلام صاحب دامت برکاتہ کے ساتھ ایک یادگار نشست (۲) .... مولانا محمد اقبال ۱۳

تعارفِ امام غزالی (۲) .... حافظ مومن محمود ۱۹

الجماعہ کا مفہوم (۳) .... صوفی جمیل الرحمٰن عباسی ۲۸

القواعد الفقهية .... مفتی نذیر احمد ہاشمی مدظلہ ۳۴

اردو لکھنے والوں سے چند گزارشات .... حافظ حماد احمد ترک ۴۰

فتاویٰ یسئلونک .... دارالافتاء فقہ اکیڈمی ۴۵

نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم .... مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ۴۷

اداریہ

سِرِّ محبت اور سُرِ عشق

اللہ کے محبوب حضرت محمد مصطفی ﷺ اپنے صحابہ کرام سے بھی محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے، ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لیا ہوا تھا اور فرماتے تھے:((يا أَبَا أُمَامَةَ إِنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ مَنْ يَلِينُ لِي قَلْبُهُ))"اے ابوامامہ بے شک وہ ایمان والوں میں سے ہے جس کا دل میرے بارے میں نرم ہے"(مسند احمد)اظہارِ الفت کے ساتھ آپ ﷺ نے ایمان کی ایک نشانی کی طرف اشارہ بھی فرما دیا۔ لیکن اسے قدرے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انسانی دل منبعِ جذبات ہے۔ جب یہ جذبات کسی کی جانب متوجہ ہو کر اس کی ذات سے متعلق ہو جاتے ہیں تو دل میں اس ذات کی طرف ایک خاص قسم کی کشش اور رغبت پیدا ہوتی ہے جسے دل کی نرمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان کے ایمان کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے کہ اس کے دلی جذبات کی ڈور، ذاتِ رسول ﷺ سے منسلک ہو اور اس کے شَغافِ قلب پر محبت رسول ﷺ کا برقیہ پایا جائے۔ محبت کبھی تنہا نہیں بلکہ ہمیشہ کسی دوسری محبت کے سہارے ہی چلتی ہے۔ جس طرح گھروں کے دروازے ہوتے ہیں جن سے داخل ہوا جاتا ہے اسی طرح محبت کے بھی دروازے ہوتے ہیں جن سے وہ دل میں گھر کرتی ہے اور جب محبت دل کے راستے رگ وپے میں سرایت کر جائے تو اگرچہ مجازی طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان محبت میں داخل ہوا لیکن در حقیقت محبت انسان کے دل میں داخل ہوتی ہے، ہاں اس کا یہ " دَخلہ " اتنا گھمبیر ہوتا ہے اور وہ دل میں گھر کر کے جان وتن پر اس طرح چھاتی ہے کہ بندے کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ تب بندے کی حالت دھند میں لپٹے ہوئے پھول کی سی ہوتی ہے کہ دھند اس پر چھائی ہے لیکن اس کا چھایا اتنا بڑا ہے کہ پھول اس میں داخل نظر آتا ہے۔

بہر حال محبت رسول ﷺ کا سہارا، اور حُبِ رسول ﷺ کا دروازہ، اللہ تعالی کی محبت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا اشارہ اس حدیث میں ملتا ہے کہ فرمایا:((أَحِبُّونِی بِحُبِّ اللهِ))(سنن ترمذی)"مجھ سے محبت کرو اللہ کی محبت کی وجہ سے"اس میں تفصیل یہ ہے کہ انسان جب اپنے خالق ومالک کو پہچان لیتا ہے اور وہ یہ جان لیتا ہے کہ اسے اس کے مالک نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اب رب کی مرضی یہ ہے کہ تم صراط مستقیم پر سفر کر کے میرا قرب حاصل کرو

اور جب تم ایک خاص حد تک ہمارا تقرب حاصل کر لو گے تو میں تمھیں اپنے قریب پائی جانے والی سچی بیٹھک یعنی جنت میں اس طرح آباد کر دوں گا کہ وہاں سے نہ نکلنا ہو گا اور نہ نکالا جانا، وہاں کی نعمتیں نہ مقطوع ہوں گی نہ ممنوع بلکہ ہر گزرتے پل کے ساتھ وہ مرفوع ہوتی جائیں گے اور ان سے فیض یاب جنتی بھی رفعتوں کی منزلوں پر منزلیں مارتا رہے گا! تو جب انسان میں عقابی روح بیدار ہو گئی اور ' منزلِ ما کبریاست ' کے مصداق انھیں اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی تو وہ ﴿إِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (الشوریٰ:٥٢) "اے نبی! بے شک آپ ضرور سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرنے والے ہیں" کے مصداق اس راستے کے راہنما کے طور پر رسول اللہ ﷺ کو جان لیتا ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ عبادت کے طریقے، بندگی کے سلیقے سکھانے اور صراطِ مستقیم کے دریچے دکھانے کا احسان محمد رسول اللہ ﷺ ہی تو کر رہے ہیں۔ معرفت رسول کا یہی وہ مقام ہے جس سے محرومی پر ان الفاظ میں تنبیہ کی گئی: ﴿أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ﴾ (المومنون:٦٩) "کیا انھوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا کہ وہ ان کے انکاری ہو رہے ہیں" اور اسی معرفت کا ثمرہ محبت ان الفاظ میں بیان کیا گیا کہ: ((مَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةً أَحَبَّهُ)) (سنن ترمذی) "جو آپ سے اختلاط کرتا معرفت کے ساتھ تو وہ آپ سے محبت کرنے لگتا"۔ تو اللہ کی پہچان بطور منزل کے اور رسول اللہ ﷺ کی پہچان بطور، نشانِ منزل کے ہو جائے تو ان دونوں کی محبت دل میں پیدا ہو جاتی ہے: ((مَنْ كَانَ اللهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا)) (متفق علیہ) "جس کو اللہ اور اس کا رسول سب سے بڑھ کر محبوب ہو جائیں" اگلی بات یہ ہے کہ یہ دونوں محبتیں مطلوب بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ (البقرہ:١٦٥) "جو ایمان والے ہوتے ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت شدید ہوتے ہیں" اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: ((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ)) (متفق علیہ) "تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والد، اس کی اولاد اور دیگر تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں"۔ " دور، رہ کر تمھیں اور بھی زیادہ چاہا" کے مصداق دوری سے محبت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ بعض عارفین کے کلام سے مستفاد، محبت کی تعریف یہ بھی ہے کہ "محبت اس سوز و تپش کو کہتے ہیں جو

محبوب کے مفقود ہوجانے سے پیدا ہوتی ہے" تو جب انسان دیکھتا ہے کہ محبوب سے دوری ہے اور ہمکناری میں دشواری ہے تو عشق کی شمع فروزاں کی لو کو تیز کرنے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتا ہے تو پھر یہی کچھ کرتا ہے۔ چنانچہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پردہ فرمانے کے بعد آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے امتیوں میں محبت کا سوز و ساز آپ کے اُن امتیوں سے زیادہ ہوتا ہے جنھوں نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ مکرر سمجھ لیں ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ بعد والوں کی محبت رسول، صحابہ کرام کی حب رسول سے زیادہ ہوتی ہے۔" قدر نبی دی جانن والے سو گئے وچ مدینے" !! صحابہ نے تو معرفت و محبت رسول کی انت کر دی کہ ان سے زیادہ محبت اب کی جا نہیں سکتی۔ ہمارا کہنا یہ ہے دوری کے اصول کے تحت بعد والوں کی محبت کے اظہار میں شدت پیدا ہوجاتی ہے یعنی" ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے"!!

محبت کے اس اصول سے ناواقفی کی وجہ سے یار لوگ ان بعد والوں کی بعض بداعمالیوں کو دیکھ کر ان کی محبت پر سوال اٹھاتے ہیں اور ایسے تبصرے کرتے ہیں کہ دیکھیں ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کا عشق تو ایسا نہ تھا۔" یہ رازِ محبت ہے پیارے، تم راز محبت کیا جانو" عشق رسول کی چوٹ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے دل پر بھی وہی پڑی تھی جو بعد والوں کے دل پر پڑی لیکن ظرف اور ساتھ ہی ' ظرفِ زمان و مکان کے بدلنے سے آواز بدل گئی ہے۔ محبوب حقیقی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم، عام محبوبوں کے طرح محبت سے ناواقف نہیں تھے اس لیے انھوں نے محبت کے اس اصول کی طرف اشارہ کیا: ((مِنْ أَشَدِّ أُمَّتِي لِي حُبًّا نَاسٌ يَكُونُونَ بَعْدِي يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ رَآنِي بِأَهْلِهِ وَمَالِهِ)) (صحیح مسلم) "میری امت میں مجھ سے شدید ترین محبت کرنے والے لوگ وہ ہوں گے جو میرے بعد آئیں گے ان میں سے ہر ایک تمنا کرے گا کہ کاش وہ اپنے اہل و عیال اور مال و دولت قربان کر کے کسی طرح مجھے دیکھ پاتا"۔

دوری زمان و مکان کے علاوہ مقام کی بھی ہوتی ہے۔ یعنی آج کل کے تمام امتی زمانی اور مکانی اعتبار سے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے دور ہیں۔ لیکن بعض لوگ اپنی نیکو کاری کے سبب ایک معنوی قرب آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے رکھتے ہیں جبکہ ان کے برعکس بعض لوگ اپنی بداعمالیوں کے سبب اس معنوی قرب سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ گویا مقام رسول عربی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے دور ہیں۔ ان لوگوں کی دوری دوسروں سے دو چند ہے۔ چنانچہ ان کی محبت کے اظہار میں شدت بھی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہو جاتی ہے۔ آخر کوئی جذبہ تو تھا جو جگر مراد آبادی جیسے بلا نوش کو نعتیہ

مشاعرے میں شرکت سے پہلے مے کشی سے توبہ کرادیتا ہے۔ وہ کوئی کسک تو تھی جو اختر شیرانی کو عین حالت نشہ میں ذکر ذات رسول ﷺ پر سسکا دیتی ہے؟ کوئی محبت تو تھی کہ جس کے تحت علَم دین غزوہ محبت میں کود کر غازی و شہید کے رتبے پر اس طرح سرفراز ہوتا ہے کہ علامہ کو کہنا پڑا" اسی گلاں کردے رہ گئے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا"!!

عام طور پر محبت کو دو طرفہ کہا جاتا ہے گویا یہ دو فریقی ہے لیکن حقیقت میں یہ سہ فریقی ہے۔ محبت میں محب اور محبوب جتنا ضروری ہیں۔ اتنا ہی ضروری رقیب بھی ہے۔ چنانچہ بعض مجازی عاشقوں نے رقیب سے خطاب بھی کرنا چاہا: " آکہ وابستہ ہیں اس حُسن کی یادیں تجھ سے" تو محبوب کی رفاقت و محبت کے ساتھ ساتھ رقیب سے رقابت بھی ضروری ہے۔ اگر آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اس کے مخالف سے نفرت بھی ضرور کریں گے۔ یہ اصول ہر محبت میں کارفرما ہے، مجازی ہو چاہے حقیقی۔!! دونوں ایک حدیث میں آتا ہے: ((إِنَّ أَوْثَقَ عُرَى الْإِيمَانِ: الْمُوَالَاةُ فِي اللهِ وَالْمُعَادَاةُ فِي اللهِ وَالْحُبُّ فِي اللهِ وَالْبُغْضُ فِي اللهِ)) (صحیح الجامع) "ایمان کی مضبوط کنڈا یہ ہے اللہ کی خاطر دوستی اور اللہ کی خاطر دشمنی کرنا اور اللہ کی خاطر محبت اور اللہ کی خاطر نفرت کرنا ہے" ایک حدیث میں فرمایا ((مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ وَأَعْطَى لِلَّهِ وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدِ اسْتَكْمل الْإِيمَان)) (سنن ابی داؤد) " جس نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ ہی کے لیے نفرت کی، اللہ ہی کے لیے دیا اور اللہ ہی کی خاطر روکا تو اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کی"۔

تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ دوستی کے ساتھ دشمنی اور محبت کے ساتھ نفرت کا لفظ بھی لایا جارہا ہے اس لیے کہ روشنی کو اندھیرے ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ بطور مثال نیوٹن کے تیسرے قانون حرکت کو بھی لینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہر عمل کا ردعمل، قوت میں عمل کے برابر لیکن سمت میں مخالف ہوتا ہے "تو انسان اللہ سے جتنی زیادہ محبت کرے گا تو اس کے مخالف سے اس کی نفرت بھی اتنی ہی شدید ہوگی:

محبت ہو تو بے حد ہو، جو نفرت ہو تو بے پایاں کوئی بھی کام کم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا

تو عام طور پر اللہ تعالی سے محبت کرنے والا اور اللہ کی خاطر دوسروں سے الفت کرنے والا، اللہ ہی کی خاطر کسی سے نفرت و عداوت کا شدید مظاہرہ بھی ضرور کرے گا۔ الا یہ کہ اس کا دعوی محبت جھوٹا ہو یا یہ کہ اس کی شخصیت دوغلی و دہری ہو یا نفسیاتی طور پر وہ بیمار ہو:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم   رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اب اس فرمان رسول ﷺ کی طرف آتے ہیں جس سے ہماری بات شروع ہوئی تھی کہ ”مومن وہ ہے جس کا دل ہمارے لیے نرم ہے“ تو جس کا دل رسول اللہ ﷺ کے لیے نرم ہوگا تو اس کا دل رسول اللہ ﷺ کے مخالفوں کے لیے سخت بھی ضرور ہوگا۔ جس کا دل رسول اللہ ﷺ کے لیے زیادہ نرم ہوگا اس کا دل مخالف رسول کے لیے زیادہ سخت ہوگا۔ جو اللہ کے رسول ﷺ کی محبت میں پختہ ہوگا وہ دشمن رسول کی نفرت میں بھی پکا ہوگا۔ جس کے دل میں عشق رسول ﷺ کی شمع دہک رہی ہوگی اس کے دل میں شاتم رسول کے خلاف نفرت کا الاؤ بھی ضرور بھڑک رہا ہوگا۔ سوال ہے کہ دورِ پیغمبر سے سینکڑوں سال کی دوری پر کھڑا، ایک امتی جو اپنے حضور کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جان و مال قربان کرنے پر آمادہ ہے تو کیا وہ اپنے پیغمبر کی توہین پر خاموش رہے گا؟ کیا وہ توہین کرنے والوں اور ان شاتموں کی دوستی کا دم بھرنے والوں سے آمادہ پیکار نہ ہوگا۔ ”دیوانوں کی سی نہ بات کرے تو اور کرے دیوانہ کیا“ تو اپنی جان نچھاور کرنے پر تیار ہونا اور جان نچھاور کر دینا کوئی نئی بات نہیں۔

جس طرح اللہ نے کسی شخص میں دو، دل نہیں رکھے، جس طرح کسی انسان کی دو مائیں نہیں بنائیں۔ وہ جیسے اللہ کے نبی نے فرمایا تھا کہ رسول خدا کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی ایک گھر میں جمع نہیں ہوسکتیں اسی طرح کسی انسان کے دل میں رسولِ عربی اور کافرِ غربی کی محبت یکجا نہیں ہوسکتیں۔ تو اسلامی ریاست کے قیام، اللہ کے نبی سے وفاداری اور مدینہ کی خاکروبی کا دعوی بھی ہو اور فرانس اور اہل مغرب کی چاکری و پرستاری بھی جاری رہے تو خوشامدیوں اور سرپرستوں کی ناجائز حمایتوں کے باوجود یہ آپ کے جھوٹے کارناموں میں ایک روشن کارنامے کے سوا کچھ نہیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جب صاحب بدعت کی تعظیم کی جائے تو اللہ کا عرش کانپ اٹھتا ہے تو اندازہ کریں صاحب سب و شتم کی تعظیم کرنے پر اللہ کا غضب کتنا بڑھتا ہوگا اور تخت الٰہی کیسے کانپ اٹھتا ہوگا اور اللہ کے تخت کے اضطراب پر آپ اپنے تخت کی کا ثبات دیکھ رہے ہیں تو دیکھتے رہیں لیکن ہمیں تو آپ کا تختہ نظر آتا ہے!!

معیشت کی خرابی کا بہانہ، نیا نہیں پرانا ہے، لوگ پہلے بھی اس بہانے کی آڑ میں اپنے خبث باطن کا اظہار کرتے رہے ہیں لیکن قرآن پاک میں انھیں بیمار ذہنیت کا حامل قرار دیا گیا ہے: ﴿فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ

فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَى أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ﴾ (المائدہ:۵۲)"تم ان لوگوں کو دیکھو گے کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ بھاگم بھاگ اُن میں گھستے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ ہمیں گردش زمانہ کا ڈر ہے"۔اس مریضانہ سوچ کو ترک کرکے اصل میں یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ان لوگوں سے ہمارے تعلقات نہیں رہ سکتے جو ہمارے دین اور پیغمبر کی ہنسی اڑاتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (المائدہ:۵۷) " اے اہل ایمان، اہل کتاب اور کافروں کے ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنھوں نے تمھارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے۔اگر تم واقعی ایمان والے ہو تو پھر اللہ کا تقوی اختیار کرو"۔

اگر ہم دورنگی ترک کرکے غیرت دینی کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ہماری معاشی بدحالی کو بھی دور کردے گا۔اس لیے کہ وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ (المنافقون :7)" آسمانوں اور زمینوں کے خزانے اللہ ہی کے لیے ہیں لیکن منافقین اس کی سمجھ نہیں رکھتے"۔

اہلِ مکہ کی معیشت کا انحصار حاجیوں کی آمد پر تھا، حکم ہوا کہ مشرکین حرم کے نزدیک نہ آنے پائیں۔شیطان سے بعید نہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں خرابیِ معیشت کا وسوسہ ڈالتا تو اللہ تعالی نے اہل ایمان کو بشارت دیتے ہوئے فرمایا: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (توبہ:۲۸)" اور اگر تم تنگدستی کا خوف رکھتے ہو تو عنقریب اللہ تمھیں اپنے فضل سے غنی کردے گا اگر وہ چاہے گا اور بے شک اللہ علم و حکمت والا ہے"۔

درسِ قرآن

سورۃ الحجر آیت: ۹۵،۹۴

حافظ حماد احمد ترک، نائب ناظم شعبہ تحقیق وتصنیف، فقہ اکیڈمی

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ * إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ﴾

" پس جس بات کا آپ کو حکم دیا جارہا ہے اسے علی الاعلان لوگوں بیان کریں، اور مشرکین کی پروامت کریں۔ بے شک ہم آپ کی طرف سے ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں جو (آپ کا) مذاق اڑاتے ہیں"۔ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کو تبلیغ عام کا حکم دیا گیا ہے کہ توحید کے جس پیغام کے آپ امین بنائے گئے ہیں، اسے ڈنکے کی چوٹ بیان کریں۔ اگرچہ مشرکین پہلے کی طرح آپ کی دعوت اور آپ کی شخصیت کو ٹھٹھے مذاق اور استہزا کا نشانہ بنائیں گے بلکہ اس میں شدت بھی آئے گی لیکن آپ ان کی پروانہ کریں۔ ان کے مقابلے میں ہم آپ کے لیے کافی ہیں"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق، آپ کا استہزا کرنے والوں کے سرخیل، ولید بن مغیرہ، اسود بن عبدیغوث، اسود بن عبد المطلب، حارث غیطل السہمی اور العاص بن وائل اسہمی وغیرہ تھے۔ اللہ تعالی نے ان سے اپنے رسولِ پاک کی توہین واستہزا کا انتقام لیا چانچہ ان میں سے کوئی اندھا ہو کر مرا، کوئی پھوڑے پھنسیوں مرقع بن کر رہا اور واصل جہنم ہوا، کسی کے پیٹ میں زرد پانی پڑ گیا اور اس کا پاخانہ منھ کے راستے نکلنے لگا۔ کسی کے ناسور نے آ لیا اور پیپ اور کچ لہو سے بھر گیا۔ غرض یہ کہ گھن انگیز بیماریوں کا شکار ہو کر مرے،، (المعجم الاوسط للطبرانی، رقم الحدیث :۴۹۸۶) رسول اللہ ﷺ کی یہ کرامت وبزرگی کہ آپ کا استہزا کرنے والا خدائی انتقام سے دوچار ہو؛ آج بھی باقی ہے، چنانچہ آج کے گستاخ بھی خدائی انتقام سے بچ نہیں سکتے اور جلد یا بدیر کسی آفت کا شکار ہو کر رہیں گے۔ البتہ ان آیات کی روشنی میں ہمارے کرنے کا کام وہی ہے جس کا حکم رسول اللہ ﷺ دیا گیا تھا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ "پس جس کا حکم آپ کو دیا گیا آپ اسے کھل کر بیان کریں،، لہذا ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم توحید الہی شریعت کی بالادستی اور شرعی احکام کے اجرا، حتی کہ توہین رسالت تک کی سزا کو بھی ڈنکے کی چوٹ بیان کریں اور اس ضمن میں کسی کافر، فرد یا ادارے کی ملامت واستہزا کی پرواہ نہ کریں۔ دین وشریعت کے احکامات پر کوئی سمجھوتہ نہ کرنے اور ڈٹ جانے والے کردارے

لیے کچھ خصوصیات ضروری ہیں۔

زیرِ مطالعہ آیات سے ماقبل آیات میں تین ہم صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان آیات میں خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے لیکن آپ کے واسطے سے یہ حکم پوری امت کو دیا جا رہا ہے: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ * لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ ''ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی آیات اور قرآن عظیم سے سے نوازا ہے۔ آپ اپنی آنکھ اٹھا کر بھی اس چیز کو نہ دیکھیے جو ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو برتنے کے لیے دے رکھی ہے اور ان پر غم نہ کیجیے اور مسلمانوں پر شفقت و رحمت کا مظاہرہ فرمائیے''۔ تو امت محمد ﷺ کو چاہیے کہ دعوت اسلام سے خائف ہو کر، توہین آمیز ہتھکنڈے اختیار کر لینے والے عالمی ساہوکاروں کی چمک دمک اور جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری پر نظر طمع دراز نہ کرے بلکہ اپنے پاس موجود عظیم ترین دولت و نعمت قرآن حکیم سے لو لگائے اور باہم نرمی و شفقت کا سلوک کرے تاکہ امت جسدِ واحد کی صورت متحد رہے۔ اسی صورت وہ دعوت اسلام پر قائم اور توہین رسالت کے مجرموں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ آیات زیر مطالعہ کے مابعد بھی اہم احکام دیے گئے ہیں: ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ * وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾ ''پس تسبیح کریں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور سجدے کرنے والوں میں ہو جائیں اور اپنے رب کی عبادت پر گامزن رہیں یقینی چیز (موت) کے آنے تک''۔ شریعت کے احکام کی پاسداری اور محافظت کے لیے وہ کردار، درکار ہے جو ذکر و اذکار، سجدوں کی کثرت اور عبادت کی بھٹیوں سے گزر کر کندن بن چکا ہو۔ اسی سے قرب الٰہی کی منازل طے ہوتی ہیں اور اسی سے اُس دینی غیرت و حمیت میں اضافہ ہوتا ہے جو دین اور صاحب دین علیہ السلام کے ناموس کی حفاظت میں فیصلہ کن عامل کا کردار ادا کرتی ہے۔

درسِ حدیث

ابنِ عباس

عَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:((إِنَّمَا سُمِّيَ القَلْبَ مِنْ تَقَلُّبِهِ إِنَّمَا مَثَلُ القَلْبِ مَثَلُ رِيشَةٍ بالفَلاةِ تَعَلَّقَتْ فِي أَصْلِ شَجَرَةٍ يُقَلِّبُها الرّيحُ ظَهْراً لِبَطْنٍ))(صحيح الجامع الصغير، مسند احمد)

سیدنا ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' دل کو قلب کا نام اس کی صفت تَقَلُّب کی وجہ سے دیا گیا ہے، بے شک قلب کی مثال ایسے پتے کی طرح ہے جو ایک صحرا میں کسی درخت کے تنے سے جڑا ہوا ہو، جسے ہوا بار بار الٹا سیدھا کرتی رہتی ہے''۔

عربی زبان کے سہ حرفی مادے(ق ل ب) میں ایک حال سے دوسرے حال میں چلے جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے جیسے لغت عرب میں (قَلّب الصفحة) کا ترجمہ ہوگا'' اس نے کتاب کا صفحہ پلٹا''۔اسی مادہ لغوی سے تَقَلُّب کا لفظ بنا ہے جس کا معنی بھی تغیر و تبدل ہی ہے اور اسی سے دل کے لیے اسم '' قَلب '' وضع ہوا ہے۔منشاے کلام نبوی یہ ہے کہ یہ وضعِ اسم، مسمّٰی کی صفت کے مطابق ہی ہوا ہے کہ جیسے دلی کیفیات بدلتی رہتی ہیں اسی طرح دل کے لیے نام بھی وہ وضع ہوا جس میں تغیر و تبدل کا مفہوم پایا جاتا ہے۔پتے کی مثال کا مفاد یہ ہے کہ انسان کا دل خارج کے خواطر و حوادث کا اثر بہت جلدی قبول کرتا ہے۔جس طرح کھلے میدان میں درخت کے تنے کے ساتھ لٹکتا پتا، مستقل ایک رخ پر نہیں رہ سکتا بلکہ ہواؤں کے زیر اثر وہ کبھی سیدھا ہوتا ہے اور کبھی الٹا ہو جاتا ہے۔اسی طرح انسان کے دل کو بھی کسی ایک جانب قرار نصیب نہیں ہوتا بلکہ خارجی عوامل کے تحت وہ ہر لحمہ اپنے رخ کو بدلنے پر تیار رہتا ہے۔مثال میں بیان کردہ پتے کے ایک حال پر برقرار رہنے کے لیے ہوا کے مقابلے میں کسی دوسرے عامل کی ضرورت ہے مثلاً کوئی ہاتھ جو اسے مسلسل سیدھا پکڑے رکھے تاکہ ہوا، اسے الٹا نہ سکے۔اسی طرح انسانی دل کو سیدھا رکھنے کے لیے مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔صاحب قلب کو چاہیے کہ اس کی حفاظت پر بہت زیادہ دھیان رکھے۔کوشش کرنی چاہیے کہ دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ اور آخرت کی یاد کو بسایا جائے۔ایسی صحبت اور ان امور کو اختیار کیا جائے جو دل کو آخرت اور خدا کی جانب متوجہ رکھیں اور اِن سے مشغول کرنے والی صحبت اور امور سے خود کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہ کے ساتھ ایک یادگار نشست (۲)

مولانا محمد اقبال، معاون شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

جب مجھے اندازہ ہوا کہ حضرت کو اس موضوع پر مزید بات ناگوار گزرتی ہے تو میں نے گفتگو کا رُخ موڑتے ہوئے کہا کہ استاد جی! ایک تأثر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ جو علماء تحریک پاکستان میں شریک تھے آزادی کے فوراً بعد، وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے، جس سے ایک خلا پیدا ہوا، اور اس کا دینی طبقے کو نقصان ہوا؟ فرمایا: یہ تأثر درست نہیں ہے، اس لیے کہ آئینی طور پر قرارداد مقاصد اور دستور کی بنیادی اسلامی دفعات کی صورت میں جو کامیابی ہمیں ملی ہے ان علماء کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ جمعیت علمائے اسلام کے بانی علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ علماء انتخابات میں براہ راست شریک نہ ہوں، بلکہ انتخابی عمل سے بالا رہیں تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ اقتدار کے خواہشمند ہیں۔ تو اس طرح ان کا عوام میں اعتماد بحال رہے گا۔ نظامِ اسلام پارٹی میں ایسے لوگ تھے جو علماء تو نہیں تھے، البتہ تعلیم یافتہ اور دین دار لوگ تھے اور علماء کے زیر اثر تھے۔ ان کی ساری پالیسیاں جمعیت علمائے اسلام طے کرتی تھی، کیوں کہ جمعیت علمائے اسلام انتخابات میں حصہ نہیں لیتی تھی، مگر نظامِ اسلام پارٹی کی حمایت کرتی تھی۔ تو اسی نظامِ اسلام پارٹی نے بنگال (مشرقی پاکستان) میں حکومت بنائی، یہاں تک کہ مغربی پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزرا کی بڑی تعداد اسی پارٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ اگر گورنر جنرل غلام محمد دستور ساز اسمبلی نہ توڑتے تو نظامِ اسلام پارٹی نے آئین بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اگر غور کیا جائے تو آج بھی ان کی پالیسی بہتر ہے، یعنی علمائے کرام حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کا فریضہ ادا کرتے رہیں۔ اسی زمانے میں حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے پورے ملک کے دورے کیے، انتخابات میں کھڑے ہوئے بغیر ایک فضا بنائی، میں نے اس کی کچھ تفصیل اپنی آپ بیتی ”یادیں“ میں لکھی ہے، اور مزید بھی ان شاء اللہ لکھنے کا ارادہ ہے۔

سیاست پر بات کرنے کے بعد ہم تعلیم کے موضوع پر آئے۔ میں نے کہا کہ آج کل ہمارے ملک میں طبقاتی نظام تعلیم ہے، عصری اداروں میں پڑھنے والے اور دینی مدارس کے طلبہ کے درمیان ایک خلیج ہے، ہم ایک دوسرے کے مزاج سے ناواقف ہیں، کیا وفاق المدارس نے اس کے حل کے لیے سوچا ہے؟ جواب میں فرمایا: کافی تبدیلیاں آرہی ہیں، دیکھیں! یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کچھ ضروری مضامین کو نصاب میں داخل کرنا چاہیے، لیکن اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ ہمارے طلبہ کو ملازمتیں ملیں، ٹھیک ہے اگر اس کے ذریعے ملازمتیں ملیں بھی، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن مقصود اصلی وہ نہیں، مقصود اصلی در حقیقت یہ ہے کہ ایک عالمِ دین کو دین کا پیغام اس طرح لوگوں تک پہنچانے کے قابل ہونا چاہیے کہ ((کلّموا النّاس علی قدرِ عقولھم)) کے مصداق لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان سے گفتگو کر سکے۔ تو اس کے لیے ضروری ہے کہ علما انگریزی سیکھیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب کام ہم خود کریں، حکومت کے کہنے پر نہیں۔ کیونکہ حکومت کے ساتھ ہم کوئی رشتہ نہیں جوڑنا چاہتے۔ پچھلے دنوں ہمارا حکومت کے ساتھ اس پر باقاعدہ اختلاف ہوا، حکومت سے بھی فوج سے بھی۔ ماضی میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم تمام مدارس کو تسلط میں لینا چاہتے تھے۔ الحمد للہ ہم نے اُس وقت بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور شاید کسی نے اس طرح بات نہ کی ہو جو میں نے موجودہ حکومت کے ساتھ حالیہ میٹنگ میں ایک صاحب منصب اور بااختیار آدمی سے کہی، وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کا اظہار کرتے تھے، مگر اس دن ان کے چہرے سے ان کی پریشانی عیاں تھی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جو منصوبہ لے کر آئے تھے وہ پورا نہیں ہوا۔ اب تک ہمارے ان کے ساتھ جو مذاکرات ہوئے، ہم نے ان کا ایک مطالبہ بھی قبول نہیں کیا۔ اور ایک بات میں نے سب سے کہی کہ ہم اپنے طور پر نصاب میں ضروری تبدیلیاں کریں گے، لیکن گورنمنٹ کے ساتھ کوئی رشتہ جوڑنا نہیں چاہتے۔ پھر انھوں نے ایک ڈائریکٹریٹ قائم کیا، اس پر بھی ہمارے تحفظات ہیں۔ عصری اور دینی اداروں میں میٹرک تک ایک نصاب ہونا چاہیے، بلکہ ہماری رائے ہے کہ انٹرمیڈیٹ تک ایک نصاب ہو، تاکہ فی الجملہ ساری چیزوں کا تعارف ہوجائے، اس کے بعد پھر الگ الگ شعبوں کا انتخاب ہو۔ بہر حال اب ہماری کوشش ہے کہ جدید فلکیات، پولیٹکل سائنس، معاشیات، اسی طرح مختلف ضروری مضامین مدارس کے نصاب کا حصہ بنائیں، تاکہ ہمارے طلبہ کو اندازہ ہو کہ دنیا کہاں جارہی ہے۔ اب آہستہ آہستہ یہ چیزیں نصاب میں داخل کی جارہی ہیں۔ لیکن ایک وقت تھا کہ عالم کی سند کے لیے لکھنا

جاننا شرط نہیں تھا، یعنی باقاعدہ مہتمم کی ذمے داری تھی کہ امتحان میں اگر کسی طالب علم کو لکھنا نہیں آتا تو اسے کاتب فراہم کیا جائے، اس لیے کہ لکھنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ یہ کہا جاتا تھا کہ ہم "امّتِ امّیہ" ہیں، ہمیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ایک عرصے تک یہ سلسلہ جاری تھا، مجھے یاد ہے کہ وفاق کے امتحان میں کاتب فراہم کیا جاتا تھا۔ اب رفتہ رفتہ حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ وہ کتابیں جن کا کوئی مصرف نہیں تھا، مثلاً صدرا، خیالی، مُلا حسن، سُلّم، میبذی، شمس بازغہ، بطلیموس کی فلکیات، یہ سب نصاب سے نکالی جا چکی ہیں۔ اب نئی کتابیں داخل نصاب ہیں، رفتہ رفتہ نصاب بہتر ہو رہا ہے۔

ایک سوال ہوا کہ نصاب میں اتنے سارے مضامین شامل ہونے کے بعد طالب علم ان کو صحیح ضبط نہیں کر سکے گا؟ اس کے جواب میں فرمایا: اگر پڑھنے والے ڈھنگ سے پڑھیں اور پڑھانے والے ڈھنگ سے پڑھائیں تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ دیکھیں! شیخ الہند اس سال شیخ الہند نہیں بنے تھے، جس سال ان کی فراغت ہوئی، اور حکیم الامّت جس دن مدرسے سے فارغ ہو کر نکلے اسی دن وہ حکیم الامّت نہیں بنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دورۂ حدیث کا سال در حقیقت علم کا آغاز ہے، یہ علم کی انتہا نہیں ہے، اس کے بعد انسان کے اندر صلاحیت پیدا ہوگی، اب تک پڑھنے سے مطالعے کا ایک سلیقہ آجاتا ہے۔

فیض محمد نے ان علوم کے بارے میں پوچھا، جو ایک عالم دین کے لیے آج کل ضروری ہیں اور جن میں اختصاص کی ضرورت ہے، جو معاشرے کے لیے مفید ہوں۔ اس کے جواب میں فرمایا: دیکھیں! تین چار ایسے میدان ہیں جن میں ایک عالم دین کے لیے کرنے کے کام ہیں، ایک تو مغربی فلسفہ ہے، اس میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ بہت سے لوگ فلسفے کے راستے سے گمراہ ہوئے۔ مغربی فلسفے کو سمجھ کر اس کی طرف سے وارد ہونے والے اشکالات کا جواب اسی وقت ممکن ہے کہ جب اسے اچھی طرح سمجھا جائے۔ ایک عالم دین کو اس سے واقف ہونا چاہیے، ایک میدان تو یہ ہے۔

اسی طرح معاشیات ایک اہم موضوع ہے، علمائے کرام کو اسے سمجھنے اور اس میدان سے واقفیت ضروری ہے۔ اس وقت دنیا میں جنگ معیشت کی ہوتی ہے، آج کل ہم جو پریشان ہیں اس کی بنیادی وجہ ہمارے کمزور

معاشی حالات ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ پاکستان معاشی لحاظ سے بہت بہتر تھا، لیکن آج یہ حالت ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ موجودہ دور میں ایک ملک اور ایک قوم کے مضبوط اور مستحکم ہونے کا دار و مدار مضبوط معیشت پر ہے۔ اگر معیشت مضبوط اور توانا ہوگی تو ملک مستحکم ہوگا۔ اگر فرض کریں جنگ ہو تو آپ کے پاس بہتر سے بہتر ہتھیار کیوں نہ ہوں، جب تک آپ کی معیشت مستحکم نہ ہو، آپ نہیں جیت سکتے۔ ہمارے پاس اسلحہ، ہتھیار بھارت سے بہتر ہیں، لیکن کیا ہمارا پٹرول بیس دن کام دے گا؟ جنگ لڑنے کے لیے تو پٹرول چاہیے، تو ہمارے پاس ذخیرہ اتنا ہے کہ جنگ برداشت کر سکیں؟ دس دن، پندرہ دن بعد پتا چلے کہ پٹرول ختم ہوگیا ہے تو ہم کیسے لڑیں گے؟ اسی طرح جب ہماری معاشی حالت بہتر ہوگی تو دنیا ہماری بات سنے گی۔ تو معیشت ایک اہم علم ہے، علمائے کرام کو اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح سیاسیات ہیں، یعنی علم سیاست، کہ اہل حل و عقد کون ہوں گے؟ ریاست کیا ہوتی ہے؟ دار الاسلام کی تعریف کیا ہے؟ اس طرح کے بہت سارے مسائل ہیں۔ میری کتاب ''اسلام اور سیاسی نظریات'' میں اس موضوع پر بحث موجود ہے، آپ اس کا مطالعہ کریں۔

اسی طرح ایک وقت تھا کہ دنیا میں چرب زبانی تھی، حسّ مزاح اور خوش طبعی سے محفل کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ لیکن آج کی دنیا کا جو مجموعی مزاج ہے، وہ سنجیدہ پہلوؤں اور سنجیدہ دلائل کا مزاج ہے، تو اس مزاج کے تحت دین کی بات زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ ایک عالم دین کو بات کرنے کا اسلوب اور اس کا سلیقہ آنا چاہیے۔ حالانکہ ہمارے علوم بڑے پختہ ہیں، اتنے پختہ ہیں کہ اصولِ فقہ ہے اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی، اصولِ حدیث بہت اعلیٰ درجے کا علم ہے۔ لیکن جب ہم اس کو پیش کریں دنیا کے سامنے تو ان کی ذہنیت اور ان کے مذاق و مزاج کو مد نظر رکھیں۔ تو اب ان مضامین کو آہستہ آہستہ نصاب کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ مضامین اگر نصاب میں نہیں بھی ہیں، تو اب بھی اچھی استعداد رکھنے والے طلبہ فارغ ہونے کے بعد بھی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ علمِ سیاسیات ہے، اس کو پڑھنے کے لیے کسی استاذ کی ضرورت نہیں ہے، کوئی لمبے چوڑے فلسفے کی ضرورت نہیں ہے، معلومات ہیں، اپنے طور پر مطالعہ کر لیں۔ البتہ معاشیات میں اُستاذ کی رہنمائی کی ضرورت ہے، اس لیے کہ یہ اتنا مرتّب نہیں ہے جس طرح باقی علوم مرتّب اور منضبط ہیں۔ مگر ایک عالم کے لیے جتنی معاشیات جاننا ضروری

ہیں، وہ تقریباً میں نے اپنی کتاب ”اسلام اور جدید معیشت وتجارت“ میں ذکر کی ہیں۔ وہ کم از کم اتنا اگر پڑھ لیں تو ایسا نہیں ہوگا کہ وہ کوئی ہوا کی بات ہو۔

جناب یاسین مدنی جو ماشاء اللہ ایک ویژنری آدمی ہیں، وہ حضرت کے وژن کو جاننے کی جستجو میں تھے، انھوں نے پوچھا کہ معاشیات کے میدان میں آپ کا وژن کیا تھا؟ تو فرمایا: بس مجھے شروع ہی سے سود سے نفرت تھی، کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ فَأْذَنُواْ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ﴾ تو اس لیے میں اس طرف متوجہ ہوا کہ اس کے خلاف کام کیا جائے، اور میں نے سوچا کہ مسلم دنیا کو سودی نظام سے کیسے بچایا جائے، تو میں نے علم معاشیات کا مطالعہ اس نقطۂ نظر کے ساتھ کیا۔ اور اللہ کی توفیق سے اس پر کام کیا اور الحمدللہ اس کے اچھے نتائج سامنے آئے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کو برا تو سب کہتے ہیں مگر اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہو، اس پر غور نہیں کیا جاتا۔ تو میں نے اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ کیا، اور اس پر محنت کی، کیونکہ معاشیات ایسا علم ہے کہ جو اس طرح کا مرتب نہیں ہے جس طرح ہمارے ہاں اور علوم ہیں۔ میں نے اس کے نظریات کو صحیح سمجھنے میں بہت محنت کی، مختلف معاشی نظاموں کا تقابل کیا۔ کیونکہ شروع میں جب کوئی آدمی کسی ایسے موضوع پر کام کرتا ہے، جس پر پہلے کام نہ ہوا ہو، تو اس پر زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ سمجھ لیں! میری محنت کا حال یہ تھا کہ اُس وقت میں دار العلوم میں تین چار سبق پڑھایا کرتا تھا۔ اور شام کو دو گھنٹے دارالافتاء میں کام کرتا تھا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر یہاں سے بس پکڑتا تھا، بس کا ڈنڈا پکڑ کر، اس میں کھڑے ہو کر صدر تک جاتا تھا۔ صدر سے دوسری بس میں ٹاور جاتا تھا، وہاں ایک لائبریری تھی، اس میں معاشیات کا مطالعہ کرتا تھا۔ چونکہ اُس زمانے میں میرے ذمے عدالتی کام بھی تھے، ان پر بھی کام کرتا تھا۔ اور معاشیات کو سمجھنے کے لیے ایک استاذ سے پڑھتا تھا، اور ان کو (ہدایہ) پڑھاتا بھی تھا۔ پھر رات کو گیارہ بجے گھر واپس آکر صبح کے اسباق کے لیے مطالعہ کرتا اور ”اظہار الحق“ کا کچھ نہ کچھ ترجمہ بھی کرتا تھا۔

شرکاے محفل میں سے کسی نے پوچھا کہ جدید ذہن کے سوالات کے جواب کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے، تو فرمایا: اس کے لیے حکیم الامّت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب ” الانتباهات المفيدة“ کا مطالعہ کرنا چاہیے، یہ ایک عجیب کتاب ہے، لیکن اس کی لوگ قدر نہیں کرتے، اگر اس کے سارے مسائل ذہن نشین

ہوجائیں تو بہت سارے سوالات کا جواب مل سکتا ہے۔ مجھے فلسفے سے زیادہ مناسبت تو نہیں ہے، لیکن جب کوئی ایسا سوال آتا ہے تو مجھے انتباہات کے بنیادی اصول کام آتے ہیں۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پر محیط یہ علمی اور بابرکت محفل شب ۱۱ بجے اختتام کو پہنچی اور حضرت گھر تشریف لے گئے۔ چونکہ شیخ الاسلام حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی مجالس میں پہلے ہی سے حاضری کی سعادت حاصل ہے۔ دورۂ حدیث کے سال میں باقاعدہ تلمّذ کا شرف بھی الحمدللہ حاصل ہے۔ اس تعلق کی بناپر حضرت کے علوم ومعارف کا کچھ اندازہ پہلے ہی سے تھا۔ لیکن اس مختصر ملاقات میں وہ معلومات ہمیں حاصل ہوئیں، جو شاید درجنوں کتابوں کی ورق گردانی سے بھی حاصل نہیں ہوسکتی تھیں۔ سادگی، بے تکلفی، تواضع آپ کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ آپ کی گفتگو میں اپنائیت کا احساس جھلکتا ہے۔ یہ بات بلاتردّد کہی جاسکتی ہے کہ آپ کی علمی تحقیقی تصانیف کو جو غیر معمولی شہرت وقبولیت ملی ہے، وہ شاید موجودہ دور میں کسی اور کو ملی ہو۔ متنوع موضوعات، فقہ، علوم حدیث، علوم قرآن اور اصلاح وارشاد کے میدان میں آپ کی تصانیف سے ایک جہان استفادہ کررہا ہے۔ خصوصاً فقہ کے میدان میں آپ گویا ابوحنیفۂ عصر ہیں۔ مسائل جدیدہ کے سلسلے میں عرب وعجم کے فقہا کی نظریں آپ کی طرف اٹھتی ہیں۔ ظاہری علوم کے ساتھ آپ کو اللہ تعالیٰ نے باطنی علوم سے بھی بڑا حصہ عطا فرمایا ہے۔ آپ کی ذات تواضع وانکساری کی مجسّم تصویر ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ آپ کی شخصیت جن ظاہری اور باطنی خوبیوں کی حامل ہے، ان کے اظہار سے اپنے قلم کو قاصر پاتا ہوں۔ اور حقیقت میں حضرت کے علمی اور عملی مقام کا ٹھیک اندازہ مجھ جیسے کم فہم کے لیے ممکن بھی نہیں ہے۔ آپ امّت کے قیمتی سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ دشمنوں کے شر سے آپ کی حفاظت فرمائیں، اور آپ کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھیں۔ آمین

تعارفِ امام غزالی (۲)

حافظ مومن محمود

بہر حال سفر شروع کیا اور ارادہ کیا کہ حج کریں۔ لہٰذا سب سے پہلے حج کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ابوبکر ابن العربي المالکی رحمہ اللہ جو فقہ مالکی کے مشہور امام ہیں اور امام غزالی کے شاگرد بھی تھے، فرماتے ہیں کہ جب امام غزالی رحمہ اللہ حج کے لیے نکلے ہیں تو راستے میں ہماری ملاقات ہوئی تو میں نے امام غزالی رحمہ اللہ کو دیکھا کہ ایک لاٹھی ہے اور اوپر ایک مشکیزہ رکھا ہوا ہے اور بالکل پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو میں کہنے لگا کہ کیا آپ وہی ہیں؟ شیخنا الغزالی؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں۔ بہر حال انھوں نے امام غزّالی رحمہ اللہ سے کہا کہ آپ نے وہ ساری تدریس اور جو نظامیہ میں پڑھایا کرتے تھے اور ایک خلق کو آپ سے فائدہ ہوتا تھا وہ سب کیوں چھوڑ دیا؟ تو امام غزالی رحمہ اللہ نے نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھا کہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو اور مشہور اشعار کہے:

لما طلع بدر السعادة في فلك الإرادة
وجنحت شمس الوصول في مغارب الأصول
تركت هوى ليلى وسعدى بمعزل
وعدت إلى تصحيح أول منزل
ونادت بي الأشواق مهلا فهذه
منازل من تهوى رويدك فانزل
غزلت لهم غزلا دقيقا فلم أجد
لغزلي نساجا فكسرت مغزلي

”کہ جب سعادت کا چاند، آسمانِ ارادہ پر طلوع ہوتا ہے اور سورج جو اللہ تعالیٰ کے قریب پہنچائے گا وہ غروب ہونے کے قریب ہی ہے، امید ہے کہ اگر میں اسی رخ پر رہا تو عن قریب ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاؤں گا۔ لہٰذا میں نے

سعدا اور لیلیٰ کی (یعنی دنیا کی) محبت اپنے دل سے خارج کی اور میں سب سے پہلی منزل کی تصحیح کی طرف واپس آگیا (اور وہ پہلی منزل 'اخلاص' کی ہے اگر وہ حاصل نہ ہو تو آگے جتنی مرضی منازل حاصل ہوتی چلی جائیں کوئی فائدہ نہیں لہٰذا میں پہلی منزل کی تصحیح کی طرف واپس آگیا)۔ راستے میں شیطان بار بار بلا رہا تھا کہ یہاں رک جاؤ یہی تمھاری منزل ہے لیکن میں یہ کہتا رہا کہ نہیں یہ میری منزل نہیں ہے میری منزل تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ میں نے ان لوگوں کے لیے سوت کاتا لیکن مجھے اس سوت سے کوئی کپڑا بُننے والا نظر نہیں آیا تو میں نے اپنے تمام دھاگے توڑ دیے"۔ آج ہمارے ہاں بھی یہ رواج ہے کہ اصل شے نفعِ متعدّی ہے یعنی جس سے لوگوں کو نفع پہنچے لیکن جاننا چاہیے کہ نفع متعدّی اگر نفع لازم کے نقصان پر ہو تو وہ کوئی نفع نہیں ہے۔ پوری دنیا میری وجہ سے نجات پا جائے اور میں اللہ پاک کے دربار میں مقبولیت نہ پا سکوں تو یہ کیسا نفع ہے؟ لہٰذا نفعِ لازم ہمیشہ مقدم رہتا ہے۔ اس کے بعد امام غزّالی رحمہ اللہ حج کے لیے تشریف لے گئے ہیں اور پھر وہاں سے دمشق آئے ہیں اور ابھی دمشق میں تین چار دن سے زیادہ نہیں گزارے کہ خواب میں اشارہ ہوا کہ بیت المقدس چلے جاؤ، اس میں نکتہ کی بات یہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا جا رہا ہے اس وقت ۴۸۹ ہجری کا زمانہ ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ۴۹۱ ہجری میں بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ امام غزّالی رحمہ اللہ اس سے پہلے پہلے بیت المقدس تشریف لے گئے۔ آپ رحمہ اللہ خود فرماتے ہی کہ میں وہاں قبۃ الصخرٰی کے نیچے بیٹھ کر مراقبہ کیا کرتا تھا۔ چند دن آپ رحمہ اللہ نے بیت المقدس میں گزارے اور پھر آگے نکل کھڑے ہوئے۔

امام غزالی رحمہ اللہ پر کچھ لوگوں نے یہ اعتراض یہ بھی کیا کہ صلیبی جنگیں ہو رہی ہیں، بیت المقدس مسلمانوں کے ہاتھوں سے چلا گیا اور امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کسی تصنیف میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ گویا امام غزّالی رحمہ اللہ کو پرواہ ہی نہیں تھی کہ امت کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ جاننا چاہیے کہ امام غزالی رحمہ اللہ جس سفر پر نکلے ہیں اس میں آپ کا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی آپ کے پاس کوئی خبریں پہنچتی تھیں۔ کبھی آپ رحمہ اللہ کسی صحرا میں بیٹھے ہوئے ہیں اور کبھی کسی بیابان میں۔ کبھی کسی وادی میں تو کبھی کسی پہاڑ کے دامن کو آپ رحمہ اللہ نے اپنا مسکن بنایا ہوا ہے۔ اور یہ بھی قابلِ غور ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ جس سفر پر نکلے ہوئے تھے شاید وہ سفر اُس وقت صلیبی جنگوں سے کہیں زیادہ قیمتی تھا کیونکہ اس سفر کے نتیجہ میں ہمیں امام غزّالی رحمہ اللہ ملنے تھے جو اس سفر کے بغیر نہیں مل سکتے تھے۔ بہر حال امام غزّالی رحمہ اللہ کا صلیبی

جنگوں میں یا مسلمانوں کے لیے جہاد کے طور پر شرکت کے لیے نہ جانا اس کے بہت سے دلائل ہو سکتے ہیں۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے مغرب جانے کا ارادہ کیا۔ آپ رحمہ اللہ مراکش جانا چاہتے تھے جہاں یوسف بن تاشفین موجود تھے مگر ابھی آپ رحمہ اللہ راستے میں ہی تھے کہ خبر ملی کہ یوسف ابن تاشفین وفات پا گئے ہیں لہٰذا آپ رحمہ اللہ رستے ہی سے واپس ہو گئے۔ بہر حال بیت المقدس سے واپس پھر دمشق آئے ہیں اور وہاں ایک خانقاہ تھی وہاں تشریف لے گئے، مگر خانقاہ میں داخل نہیں ہوئے۔ کئی دن تک باہر جوتوں پر بیٹھے رہے کہ جب تک اجازت نہیں ملے گی میں اندر نہیں جاؤں گا۔ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہی نفس کُشی ہے، کیا ہی نفس کی تذلیل ہے کہ وہ ابو حامد الغزالی رحمہ اللہ کہ جن کی شہرت کا ہر جانب ڈنکا بج رہا ہے، جوتیوں پر بیٹھے ہیں۔ پھر آٹھ، دس دن بعد انھیں اجازت ملتی ہے کہ اندر آجائیں، اور پھر خانقاہ میں رہائش پذیر ہوتے ہیں اور وہاں کام کیا کرتے ہیں؟ خانقاہ کے غسل خانوں کی صفائی۔ یعنی دمشق میں امام غزّالی رحمہ اللہ اُس خانقاہ کے غسل خانے صاف کیا کرتے تھے۔ جاننا چاہیے کہ اعتراض کرنا بہت ہی آسان ہے۔ آج کل سوشل میڈیا پر بہت بدتمیزی ہو رہی ہے۔ اس عنوان سے آپ کو مختلف چیزیں ملیں گی "الغزالي الكافر"۔ کھلم کھلا آپ رحمہ اللہ کی تکفیر کی جاتی ہے۔ ویسے بھی کوئی بڑا آدمی ایسا نہیں گزرا جس کی تکفیر نہ ہوئی ہو۔ امام غزّالی رحمہ اللہ جس محنت اور مشقت سے گزرے ہیں اور جس سفر کے بعد امام غزّالی بنے ہیں وہ سارا سفر پیشِ نظر نہ رہے، کسی بندے کی قربانیاں نظر نہ آئیں اور ایک، دو باتیں پکڑ کر اس پر فتوی لگا دیا جائے تو یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ایک مرتبہ جس خانقاہ میں امام غزالی رحمہ اللہ موجود تھے وہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ اس خانقاہ میں معمول تھا کہ عصر اور مغرب کے مابین وہاں کے مفتی حضرات چہل قدمی کیا کرتے تھے اور لوگ آتے تھے اور چلتے پھرتے ان سے مسائل دریافت کرتے تھے۔ تو خود آپ رحمہ اللہ اپنا واقعہ بتاتے ہیں کہ میں غسل خانے کی صفائی کر رہا تھا تو دیکھا کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے آکر ان مفتی حضرات سے ایک فتوی پوچھا، ان کو جواب نہ آیا اور انھوں نے کہہ دیا کہ ہمیں نہیں معلوم! یہ اعرابی بہت ہی اڑیل تھا، اس نے زور سے آواز لگانی شروع کر دی کہ دیکھو ان کو کچھ آتا ہی نہیں ہے۔ امام غزّالی رحمہ اللہ نے اُسے دور سے اشارہ کیا اور اپنے پاس بلایا اور کہتے ہیں کہ میں اس وقت اس مخمصے کا شکار تھا کہ اگر میں نے اس کو صحیح طریقے پر فتوی بتا دیا تو میں ظاہر ہو سکتا ہوں جبکہ اس وقت تو میرا مقصد ہی پوشیدہ رہنا ہے۔ مگر چونکہ یہ علم کا طالب ہے اور اس وقت اسے بتانے والا کوئی بھی نہیں ہے

تو یہ مجھ پر فرضِ عین ہے کیونکہ اگر فتوی دینے والا شہر میں ایک ہی ہو تو پھر اس پر فتوی دینا فرض عین ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، اسے بلا کر پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے ؟ اس نے مسئلہ پیش کیا تو میں نے کہا کہ شاید اس کا جواب اس طرح سے ہو۔ اب وہ کچھ اس قسم کا آدمی تھا کہ اس نے پھر شور مچانا شروع کر دیا کہ بھائی دیکھو جو فتوی ان مفتیوں کو نہیں آتا وہ ایک غسل خانے کی صفائی کرنے والا بتا رہا ہے۔ جب مفتی حضرات نے آکر دیکھا اور پوچھا کہ تم نے کیا جواب دیا؟ تو امام غزالی رحمہ اللہ نے بتا دیا کہ یہ جواب ہے تو وہ کہنے لگے کہ تم کون ہو؟ اور پھر خود ہی ان مفتی حضرات نے انھیں پہچان لیا کہ ہم نے سنا ہے کہ امام ابو حامد الغزالی رحمہ اللہ مدرسہ نظامیہ چھوڑ کر راہ نوردی کر رہے ہیں، تو کہیں تم ابو حامد تو نہیں ہو؟ بہر حال جب ان سے پوچھا تو انھوں نے اعتراف کر لیا۔ تو مفتی حضرات نے کہا کہ کل سے آپ کی یہاں مجلسِ تدریس ہوا کرے گی۔ امام غزّالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ راتوں رات میں نے اپنا سامان سمیٹا اور فرار ہو گیا۔ کیونکہ میں یہاں ظاہر ہو چکا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنی اس محنت و مشقت کو یوں ضائع کر دوں کہ نظامیہ کی بجائے دمشق میں مسندِ تدریس پر بیٹھ جاؤں، چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد امام غزّالی رحمہ اللہ دمشق شہر میں چلے گئے، خانقاہ اس کے مضافات میں تھی۔ دمشق میں انھوں نے آٹھ سے دس سال قیام کیا اور اس دوران اُن کا معمول یہ رہا کہ مسجد اموی کے المنارۃ الغربیہ پر جا کر بیٹھ جاتے۔ کہتے ہیں کہ فجر سے بھی پہلے میں مینارے پر چڑھ جاتا تھا اور دروازہ بند کر لیتا تھا اور بس نمازوں کے لیے اترتا تھا اور سارا وقت غور و فکر سے کام لیتا تھا۔ یا ساتھ جو کتابیں تھیں وہ پڑھتے تھے۔ بنیادی طور پر ان کے ساتھ دو کتابیں تھیں۔ کتاب الرعایۃ، امام حارث المحاسبی رحمہ اللہ کی اور قُوت القلوب، امام ابو طالب مکی رحمہ اللہ کی، آپ دیکھیں گے تو امام حارث المحاسبی رحمہ اللہ کی کتاب الرعایۃ اور امام غزّالی رحمہ اللہ کی احیاء العلوم میں آپ کو گہری مماثلت نظر آئے گی۔ امام حارث المحاسبی رحمہ اللہ کے بارے میں امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علم المعاملہ میں امت میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے امام حارث المحاسبی رحمہ اللہ ہی ہیں۔ امام غزّالی رحمہ اللہ نے علوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک علم المعاملہ اور دوسرا علم المکاشفہ۔ علم المعاملہ کیا ہے ؟ کہ انسان اور اللہ، عبد اور معبود کا رشتہ صحیح بنیادوں پر استوار ہو جائے یہ علم المعاملہ ہے جس کو درست کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالی کی طرف سے انسان پر علوم کھلیں گے جو کہ علم المکاشفہ میں شامل ہیں۔ علم المعاملہ تو بہر حال تربیت اور پڑھنے، پڑھانے کی شے ہے جبکہ علم المکاشفہ بیان کرنے کی شے نہیں ہے۔ لہٰذا آپ دیکھیں

گے کہ احیاء العلوم میں امام غزّالی رحمہ اللہ بیان کرتے کرتے اچانک اپنا قلم روک لیتے ہیں کہ یہاں سے علم المکاشفہ کی حدود شروع ہورہی ہیں۔ لہٰذا بس! اب میں آگے بیان نہیں کروں گا۔ بہرحال امام غزالی رحمہ اللہ نے آٹھ، دس سال دمشق میں اس طریقہ پر گزارے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ اللہ پاک کی طرف سے مجھے کچھ خواب نظر آئے اور بعض صالحین نے بھی خواب دیکھے اور ایک اور بات بھی انھوں نے ذکر کی جو عموماً بیان نہیں کی جاتی فرماتے ہیں کہ بیٹیوں کی محبت بھی میرے دل میں واپس لوٹ آئی اور مجھے خیال ہوا کہ جو چھوٹی، چھوٹی میری بچیاں تھیں انھوں نے دس سال سے اپنے والد کو نہیں دیکھا تو میرے دل میں ان کی محبت پیدا ہوگئی اور خیال ہوا کہ واپس جاؤ اور اللہ تعالی کی طرف سے بھی یہی سمجھ میں آئی، اب امام غزّالی رحمہ اللہ اس درجے پر پہنچ چکے ہیں کہ وہ اپنی تعریف بھی کر سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مجھے خیال ہوا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ ہر صدی کے شروع میں امت کی اور دین کی تجدید ہوا کرے گی تو شاید یہ کام اللہ پاک مجھ سے لے لیں۔

کچھ عرصہ قبل امام غزّالی رحمہ اللہ کے فارسی خطوط، عربی میں چھَپے ہیں جو انھوں نے مختلف بادشاہوں کے نام لکھے ہیں۔ ملک سنجر سلجوقی اور کچھ وزرا کے نام۔ ملک سنجر کے نام لکھے خط میں کہتے ہیں کہ میں نے تعلیم و تعلّم میں ۴۰ سال گزارے ہیں، اور میں اس درجے پر پہنچ چکا ہوں کہ آج کل کے علماء کی انتہا یہ ہے کہ وہ میرے بعض کلام کو سمجھ سکیں بس۔ یہ خود اپنے بارے میں کہا کہ میں اس وقت اس درجے پر ہوں کہ میرے مقابلے میں کوئی نہیں ہے اور وہ لوگ جو علماء کے نام سے منسوب ہیں وہ میرے کلام کو سمجھ ہی لیں تو بہت ہے۔ خیال رہے کہ امام غزّالی رحمہ اللہ کو دیکھ کر ہم ایسے چھوٹے لوگ یہ سمجھنا شروع کر دیں کہ ہم بھی اپنے منھ سے ایسے کلمات نکال سکتے ہیں تو یہ بہت بعید از قیاس بات ہوگی۔ بہرحال واپس آتے ہیں اور سب سے پہلے اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لیے طُوس جاتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ بزرگوں کی طرف سے یہ بات آئی کہ آپ رحمہ اللہ واپس جائیں اور مدرسہ نظامیہ میں تدریس کریں۔ ۴۹۸ ہجری میں آپ رحمہ اللہ سفر سے واپس آئے ہیں اور ۵۰۵ ہجری میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ۵۵ سال کل عمر تھی۔ بہرحال وہ واپس آئے اور مدرسہ نظامیہ میں کچھ ایک، دو سال پڑھایا پھر کہتے ہیں کہ دل نہیں لگا۔ وہاں سے واپس آئے اور پھر مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں کچھ عرصہ پڑھایا وہاں بھی دل نہیں لگا۔ وہاں سے پھر واپس طوس گئے ہیں اور اپنے گھر

کے ساتھ ایک مسجد بنائی جس میں تعلیم و تعلّم ہوا کرتا اور ایک خانقاہ بنائی جس میں تربیت و تزکیہ ہوا کرتا تھا، اسی طریقے پر دو تین سال گزارنے کے بعد امام غزالی رحمہ اللہ ۵۰۵ ہجری میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وفات کے وقت کی جو کیفیت ان کے بھائی نے بیان کی ہے جسے امام عبد الرحمن الجوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الثبات عند الممات میں نقل کیا۔ فرماتے ہیں کہ جس دن ان کی وفات ہوئی، پیر کا دن تھا اور صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد آپ رحمہ اللہ نے کفن منگوایا اور کفن ہاتھ میں لے کر چومتے ہیں اور کہتے ہیں: مرحبًا بالدخول علی الملک، کہ بادشاہ کے پاس اب میری پیشی ہوگی اور میں اس کو قبول کرتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے لیے تیار ہوں۔ یہ کہا ہے اور ان کی آنکھیں بند ہو گئیں اور یہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ دیکھیں کہ اصل شے تو موت ہے: إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ، کہ اعمال کا دارومدار ان کے خاتمے پر ہے۔ تو موت بھی بہت ہی عمدہ، شریف قسم کی موت ہے۔

آخر میں کچھ واقعات نقل کرتے ہیں جو قارئین کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ ایک بڑا زبردست قسم کا واقعہ نقل کیا گیا ہے اور اس کی سَنَد بھی بالکل ٹھیک ہے اور وہ سند بزرگوں سے مروی ہے۔ ابو العباس المرسی رحمہ اللہ جنھیں اپنے زمانے کا قطب عالم کہا جاتا ہے اور ان کے بعد ابو الحسن الشاذلی رحمہ اللہ وغیرہ سے مروی ہے۔ یہ واقعہ امام غزّالی رحمہ اللہ کی کرامات میں سے ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ مراکش کے ایک بہت بڑے عالم تھے، انھوں نے ارادہ کیا کہ احیاء العلوم کے تمام نسخے جمع کر کے جلا دیے جائیں اور اس مقصد کے لیے نسخے جمع بھی کر دیے گئے۔ جمعے کے دن ان کتابوں کو جلایا جانا تھا، ایک روز قبل رات کو خواب میں دیکھتے ہیں کہ جس مسجد میں ان کی تدریس ہوا کرتی ہے اس میں داخل ہو رہے ہیں تو دیکھا کہ ایک کونے میں نور ہے اور وہاں اللہ کے نبی ﷺ موجود ہیں اور آپ ﷺ کے دائیں بائیں، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود ہیں اور امام غزالی رحمہ اللہ بھی سامنے موجود ہیں۔ امام غزّالی رحمہ اللہ نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ میری کتابوں کو جلانا چاہتا ہے، مجھے انصاف فراہم کیجیے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ کس کتاب کو جلانا چاہتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ احیاء العلوم کو، اور ساتھ ہی کتاب بھی پیش کر دی۔ تو اللہ کے نبی ﷺ نے احیاء العلوم دیکھی اور کہتے ہیں کہ اوّل سے لے کر آخر تک تمام صفحات پلٹ کر دیکھے اور پھر کہا: واللہ إنه لحسن ''اللہ کی قسم! یہ اچھا کلام ہے''۔ پھر انھوں نے کتاب ابو بکر رضی اللہ

عنہ کو دی انھوں نے بھی یہ کام کیا اور پھر عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کام کیا۔ اب خواب میں سارے صفحے کیسے پلٹائے گئے یہ تو اللہ پاک بہتر جانتے ہیں۔ اس پر اللہ کے نبی ﷺ نے اس آدمی سے کہا کہ تم آگے آؤ اور تمھیں چالیس کوڑے لگیں گے، پھر انھیں اللہ کے نبی ﷺ نے کوڑے لگانے شروع کیے اور ابھی پانچ کوڑے ہی لگے تھے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ نے شفاعت کر دی کہ بہر حال اس نے بھی اجتہادی خطا کی ہے اور آپ ﷺ کی سنت کی محبت کی وجہ سے ہی کہہ رہا ہے کہ یہ کفر اور زندقہ ہے تو آپ ﷺ انھیں معاف کر دیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے کہا کہ غزّالی جب تک معاف نہیں کریں گے تو ہم کیسے معاف کر دیں۔ اس پر امام غزالی رحمہ اللہ نے کہا کہ میں بھی معاف کرتا ہوں۔ بہر حال جب اٹھے ہیں تو انھوں نے سب کو یہ خواب سنایا اور کہا کہ یہ جلانے کا سب پروگرام ختم اور اس کے بعد خود ہی احیاء العلوم کی تدریس شروع کر دی کہ اب سے یہ کتاب پڑھائی جائے گی۔ بہر حال اس واقعے کی سند بالکل ٹھیک ہے یہ کوئی سنی سنائی کہانی نہیں ہے بلکہ بالکل صحیح سند سے نقل کی گئی ہے۔

امام حسن البناء شہید رحمہ اللہ کے ہاں بھی ایسا ہی واقعہ ہوا۔ کیونکہ امام حسن البنار حمہ اللہ نے ایک خاص مکتبہ قائم کیا تھا جس کا مقصد صرف احیاء العلوم کی پرنٹنگ تھا تاکہ اسے بہت ہی کم قیمت پر بانٹا جائے اور تقسیم کیا جائے۔ اس کا سبب امام عبد الحلیم محمود رحمہ اللہ جو امام حسن البناء رحمہ اللہ کے شاگرد رہے ہیں انھوں نے بیان کیا ہے کہ امام حسن البناء رحمہ اللہ کے پاس ایک طالب علم آیا کرتا تھا، چند دن وہ نہیں آیا تو آپ رحمہ اللہ نے پوچھا کہ اس کی خبر؟ کہاں ہے؟ کیا ہوا؟ تو پتا چلا کہ وہ عیسائی ہو گیا اور اس سے وجہ پوچھی تو وجہ یہ تھی کہ وہ ایک عیسائی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا یہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور وہ تیار نہیں ہوتی تھی۔ یہ کہتا تھا کہ ہمارے مذہب میں جائز ہے کہ تم عیسائی رہتے ہوئے میرے نکاح میں آجاؤ وہ کہتی تھی میرے مذہب میں یہ جائز نہیں ہے لہذا تمھیں عیسائی ہونا پڑے گا۔ بہر حال یہ آدمی عیسائی ہو گیا اور پھر اس لڑکی نے کہا کہ تم اندر سے عیسائیت کے لیے مخلص نہیں ہو، اخلاص ظاہر کرنے کے لیے تمھیں کلیسا میں خادم کے طور پر کام کرنا ہو گا۔ اس پر بھی یہ آدمی تیار ہو گیا اور جا کر کلیسا میں کام کرنے لگا تو کہتا ہے کہ میں کام کاج کرتے کرتے سو گیا تو خواب میں دیکھا کہ اللہ کے نبی ﷺ کے دائیں اور بائیں سیدنا موسی علیہ السلام اور سیدنا عیسی علیہ السلام تشریف فرما ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے پہلے سیدنا موسی علیہ السلام سے پوچھا کہ جو اس آدمی نے کام کیا

ہے کیا تم اس سے راضی ہو؟ انھوں نے کہا کہ میں اس سے بالکل راضی نہیں ہوں۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا تم اس سے راضی ہو؟ تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں بھی اس سے راضی نہیں ہوں! تو کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے نبی ﷺ سے پوچھا کہ اب میں کیا کروں؟ تو آپ ﷺ نے اشارہ کیا تو مثالی طور پر جنت نظر آنے لگی اور اس جنت کے ایک اعلیٰ باغیچے میں سیدنا امام غزالی رحمہ اللہ نظر آنے لگے، کہا کہ ان کے پاس چلے جاؤ اور ان سے احیاء العلوم کی تعلیم حاصل کرو۔ کہتے ہیں کہ میں وہاں گیا اور وہاں پہنچ کر میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کے بعد میری کیفیت یہ تھی کہ اللہ کے نبی ﷺ اور اسلام سے بڑھ کر مجھے کوئی محبوب نہیں تھا۔ میں عیسائیت چھوڑ کر اپنے دین پر واپس آ گیا۔ امام حسن البناء رحمہ اللہ کو یہ قصہ خود اس آدمی نے سنایا، جب آپ نے یہ قصہ سنا تو ارادہ کیا اب احیاء العلوم کو چھاپا جائے اور بہت ہی کم قیمت میں اس کو تقسیم کیا جائے۔ تو بہر حال اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات اور کرامات ہیں۔ بہت سے بزرگوں نے یہ خواب دیکھا کہ اللہ کے نبی ﷺ موجود ہیں اور امام غزّالی بھی موجود ہیں اور سیدنا عیسی علیہ السلام بھی موجود ہیں اور اللہ کے نبی ﷺ حضرت عیسی علیہ السلام پر فخر فرمارہے ہیں کہ تمھاری امت میں غزالی جیسا کوئی آدمی نہیں ہے۔ گویا امام غزّالی رحمہ اللہ اس درجے کے بزرگ ہیں کہ شاید ان سے تعلق قائم کرلینا اور ان کی شدید محبت کا پیدا ہوجانا ہم ایسے لوگوں کے لیے باعثِ نجات اور وسیلہ فلاح ہوجائے۔

امام غزّالی رحمہ اللہ پر جو ضعیف اور موضوع احادیث جمع کرنے کا الزام ہے اس سلسلے میں بھی عبدالوہاب تاج الدین السبکی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم کی وہ ساری کی ساری احادیث نقل کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے، یہ قریبًا ۹۳۴ احادیث بنتی ہیں۔ احیاء العلوم میں ۹۳۴ احادیث ایسی ہیں جن کی کوئی سَنَد پائی ہی نہیں جاتی۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ احیاء العلوم کے اسلوب پر غور کریں تو امام غزالی رحمہ اللہ پہلے آیات نقل کرتے ہیں، پھر احادیثِ مبارکہ لاتے ہیں اس کے بعد صحابہ اور تابعین کے آثار لاتے ہیں اور پھر آخر میں اپنا کلام لے کر آتے ہیں تو اگر آپ ساری کی ساری موضوع اور ضعیف احادیث نکال بھی دیں تو احیاء العلوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ امام غزالی مسائل کے استنباط میں استدلال آیات قرانی اور صحیح و مشہور احادیث سے کرتے ہیں۔ ان مسائل کی تفصیل یا بیان فضائل میں وہ ضعیف احادیث بھی نقل کرتے ہیں جن میں کافی موضوع روایات بھی شامل ہوگئی ہیں تو کتاب کی بنیاد قرآن پاک اور صحیح

احادیث پر ہے۔ اور اب تو ویسے بھی جو احیاء العلوم کا نسخہ چھپتا ہے اس میں تخریج بھی ساتھ ہوتی ہے جس میں ہر حدیث پر حکم لگا دیا گیا ہے تو اب یہ اعتراض قابل حجت نہیں رہا۔ کچھ لوگ اس اعتراض کے سبب احیاء العلوم پڑھنے سے روک دیتے ہیں کہ اس میں بڑی گمراہی ہے اور زندقہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ امام غزّالی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد بھی اور پہلے بھی کفر اور زندقہ کا حکم لگا ہے اور سب سے زیادہ حکم لگانے والے مراکش کے علماء تھے۔ علی ابن یوسف ابن تاشفین نے حکم دیا کہ احیاء العلوم کی تمام جلدیں جمع کی جائیں اور جتنے بھی نسخے پائے جاتے ہیں ان سب کو آگ لگا دی جائے اور اس نے یہ کام کیا اور وہاں کے بڑے بڑے علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ ہاں ایسا ہی ہے اس کے اندر بڑا کفر ہے، زندقہ ہے لہٰذا اس کو جلا دیا گیا۔ امام غزالی رحمہ اللہ پر جو اعتراضات ہوئے ہیں ان میں سے ایک اعتراض جو بہت سے لوگوں نے بار بار دہرایا کہ امام غزّالی رحمہ اللہ کی فکر میں اور احیاء العلوم میں تصوف کے ساتھ ساتھ فلسفے کی آمیزش ہوگئی۔ اس حوالے سے لوگ ابو بکر ابن العربي المالکی رحمہ اللہ کا ایک مشہور بھی نقل کرتے ہیں کہ: ”ہمارے شیخ نے تمام فلاسفہ کو نگل لیا مگر جب قے کرنے لگے تو قے کر نہیں سکے“۔ بہر حال اس اعتراض کا جواب تو علماء ہی دے سکتے ہیں ہمیں نہیں معلوم کہ ان کی فکر میں کس حد تک فکر و فلسفے کی آمیزش ہوئی لیکن عبدالوہاب تاج الدین السبکی رحمہ اللہ نے، جو امام تقی الدین السبکی رحمہ اللہ کے بیٹے تھے، ان تمام اعتراضات کا دلیل کے ساتھ رَد کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: نہیں، ہمارے شیخ نے فلاسفہ پر حملہ کیا اور جب واپس لوٹے تو ان کے ناخن پر بھی ان کا خون نہیں پایا جاتا تھا“۔ بہر حال یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے مگر اس سے امام غزّالی رحمہ اللہ کی فضیلت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

یہ امام غزّالی رحمہ اللہ کی ۵۵ سالہ زندگی کا ایک مختصر خلاصہ تھا اور جہاں تک امام غزالی رحمہ اللہ کی تعریفات کی گئی ہیں تو بہت سے علماء نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ تفصیل سے دیکھنا ہو تو امام غزّالی رحمہ اللہ کا سب سے طویل تعارف اور ترجمہ، امام عبدالوہاب تاج الدین السبکی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب طبقات الشافعية میں پایا جاتا ہے۔ جس کی چھٹی جلد میں، امام غزّالی رحمہ اللہ کے حالات تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ مختصراً دیکھنا ہو تو امام ذہبی رحمہ اللہ کی ”سير أعلام النبلاء“ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی الندوی رحمہ اللہ کی کتاب ”تاریخِ دعوت وعزیمت“ کی جلد اول میں بھی امام غزّالی رحمہ اللہ پر گفتگو پائی جاتی ہے۔

الجماعہ کا مفہوم (۳)

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

الجماعہ بمعنی علماے مجتہدین

پیچھے ہم نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ ما أنا عليه و أصحابي کا علم کیسے ہو تو اس کا جواب یہ دیا گیا تھا کہ اہل سنت کے علمی سلسلے سے اس کا علم حاصل کیا جائے گا۔ لیکن اس بات کا ایک اہم پہلو رہ گیا تھا۔ اس طرف آنے سے پہلے ذہن میں یہ تازہ کر لینا چاہیے کہ اہل سنت کے اصولوں میں سے ایک اصول ہم نے اجماع بھی بیان کیا تھا، تو منہجِ اہلِ سنت کا علم بھی اجماع سے ہو گا۔ علامہ مظہری الحنفی رحمہ اللہ نے یہ نکتہ بیان کیا ہے: بأي شيء يُعرف ما عليه النبي عليه السلام وأصحابه رضوان الله عليهم؟ قلنا: بالإجماع، فما اجتمع عليه علماء الإسلام فهو حق (المفاتيح شرح المصابيح) ”سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام کا قول و فعل اور اعتقاد معلوم کیسے ہو تو ہم کہتے ہیں کہ اجماع سے یعنی جن چیزوں پر علماے امت و مجتہدین کا اجماع ہے وہی حق ہیں“۔

جب الجماعہ کے پہلے مصداق، امت مسلمہ میں خرابی آئی اور لوگ سنت رسول اور منہج صحابہ سے ہٹتے ہوئے، امت مسلمہ میں شامل ہونے کے باوجود معیاری امت کے درجے سے محروم ہو گئے۔ تو اس دورِ زوال میں بھی ایک گروہ عظیم سنت رسول اور منہج صحابہ پر قائم رہا جو اہل سنت والجماعہ کے لقب سے ممتاز ہوا۔ سوال یہ ہے کہ یہ گروہ اہل سنت کیونکر گمراہ ہونے سے محفوظ رہا۔ وہ کون سا علمی مرکزیہ تھا جس کے سبب لوگ معیارِ اسلام پر قائم رہے؟ تو وہ علمی مرکزیہ، اہل علم اور مجتہدین ملت اور ان کے اجماع کا کھونٹا تھا کہ جس سے بندھ کر لوگ گمراہی سے بچے اور اہلسنت کے مدار پر قائم رہے۔ اسی وجہ سے بعض جلیل القدر ائمہ نے یہ رائے اختیار کی کہ الجماعہ سے مراد ہی اہل علم و مجتہدین کا گروہ ہے۔ امام شاطبی نے الاعتصام میں لکھا: يَدْخُلُ فِي الْجَمَاعَةِ مُجْتَهِدُو الْأُمَّةِ وَعُلَمَاؤُهَا وَأَهْلُ الشَّرِيعَةِ الْعَامِلُونَ بِهَا، وَمَنْ سِوَاهُمْ دَاخِلُونَ فِي حُكْمِهِمْ، لِأَنَّهُمْ تَابِعُونَ لَهُمْ وَمُقْتَدُونَ بِهِمْ ” الجماعہ میں اس امت کے مجتہدین اور

علمائے عاملینِ شریعت داخل ہیں اور جو ان کے سِوا (عام لوگ) ہیں وہ بھی انہی کے حکم میں ہے اس لیے کہ ان کی پیروی اور اقتدا کرنے والے ہیں"۔ امام شاطبی نے تو الجماعہ کے دوسرے مصداقات بھی نقل کیے ہیں لیکن، امام ترمذی، امام شافعی اور امام بخاری امام ابن حبان رحمہم اللہ نے اس کا ایک ہی مصداق نقل کیا ہے اور وہ یہی آخری والا مفہوم ہے یعنی الجماعہ بمعنی جماعت اہل علم !!

امام شافعی رحمہ اللہ "الرسالہ" میں حدیث مبارکہ مَنْ سَرَّهُ بُحْبُوحَةُ الْجَنَّةِ فَلْيَلْزَمِ الْجَمَاعَةَ کے تحت فرماتے ہیں: " مسلمانوں کی جماعت مختلف علاقوں میں منقسم ہے تو التزام جماعت سے یہ تو مراد نہیں ہو سکتا کہ سارے لوگ جسمانی طور پر ایک ہی جگہ رہیں، نہ کوئی اس کی طاقت رکھتا ہے اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ اس لیے کہ جسمانی قربت میں تو بعض شہروں میں کافر بھی شامل ہیں اور مسلمانوں کے فاجر و متقی بھی ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ تو اب التزام جماعت کا ایک ہی مطلب ممکن ہے اور وہ التزامِ علمی ہے کہ تحلیل و تحریم اور دیگر مسائل میں جماعت مسلمین کی پابندی کی جائے۔ پس جو ان مسائل کی بابت جماعت مسلمین کی آرا کی پابندی کرے گا وہی ہے کہ جو التزام جماعت کا اہتمام کرنے والا ہے اور جو ان کے خلاف کرے گا تو اس نے التزام کے بجائے جماعت مسلمین کی مخالفت کی۔ پس قرآن و سنت کے معانی اور اجتہادی احکامات سے غفلت الجماعہ سے الگ رہ کر ہی ہو سکتی ہے جب کہ الجماعہ کتاب و سنت کے معانی اور اجتہادی احکام سے غافل نہیں ہو سکتے"۔

امام ترمذی اپنی سنن میں الجماعہ والی احادیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: وَتَفْسِيرُ الْجَمَاعَةِ عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ هُمْ أَهْلُ الْفِقْهِ وَالْعِلْمِ وَالْحَدِيثِ "اہل علم کے نزدیک الجماعہ سے مراد فقہ و حدیث کے علم کی حامل جماعت ہے"۔

امام ابن حِبَّان اپنی صحیح میں لکھتے ہیں: والجماعة بعد الصحابة هم أقوام اجتمع فيهم الدين والعقل والعلم (صحیح ابن حبان) "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد الجماعہ کا مصداق وہ لوگ ہیں جو عقل دین اور علم کے جامع ہوں"۔ امام بخاری نے صحیح بخاری کتاب الفتن میں ایک باب قائم کیا ہے: (قَوْله بَاب وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا) وَمَا أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِلُزُومِ الْجَمَاعَةِ وَهُمْ أَهْلُ الْعِلْمِ " اللہ تعالیٰ کے فرمان وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا کا بیان اور اللہ نے جس

الجماعہ سے وابستہ رہنے کا حکم دیا ہے اس کا بیان اور اس سے مراد اہل علم ہیں"۔

امام ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں بظاہر آیت مبارکہ ﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ "اسی طرح ہم نے تمھیں بنایا بہترین امت" اور لزوم جماعت کی احادیث میں کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ لیکن اس میں ایک معنویت ہے، وہ یہ کہ براابن عازب رضی اللہ عنہ (وَسَطًا) کی تفسیر الْعَدْلُ سے کرتے ہیں یعنی یہ امت عدالت کی حامل ہے اگر چہ آیت میں لفظ امت عام ہے لیکن اس سے مراد گروہ خاص ہے۔ کیوں کہ امت میں جاہل، اہل بدعت اور غیر عادل لوگ سبھی شامل ہیں تو یہ بہترین کہلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ بلکہ امت میں سے اہل سنت اور علم شریعت کے ماہرین ہی عدل کے معیار پر پورا، اترتے ہیں اور وہی الجماعہ کے مصداق ہیں"۔ امام ابن حجر کی توجیہہ کو آیت مبارکہ ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ﴾ کی روشنی میں دیکھیں تو یہ بات مزید سمجھ میں آتی ہے کہ امت سے مراد، امت کے اندر کا ایک گروہ ہے نہ کہ پوری امت!!

ہم نے الجماعہ کے ایک سے زیادہ مصداقات نقل کیے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ امام بخاری، امام شافعی اور امام ترمذی الجماعہ سے مراد جماعت اہل علم اور ائمہ مجتہدین کو قرار دے رہے ہیں۔ کیا یہ سوچا جاسکتا ہے کہ یہ چار جلیل القدر ائمہ کرام، الجماعہ کے دوسرے مصداقات سے ناواقف تھے یا پھر ان مصداقات سے متفق نہ ہونے کی وجہ سے ان کا ذکر نہیں کیا؟ ظاہر ہے یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ الجماعہ کے جو دوسرے مصداقات ہیں ان میں سے بعض میں انقطاع ہو جاتا ہے۔ مثلاً کبھی مسلمان کسی امیر پر متفق ہوں گے اور کبھی نہیں ہوں گے لیکن الجماعہ کا یہ جو آخری اطلاق ہے اس میں کوئی انقطاع نہیں ہو گا یہ ہمیشہ موجود رہے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ الجماعہ کے دوسرے مصداقات پر، اہل علم و مجتھدین والے مفہوم کو ترجیح حاصل ہے۔ اس لیے امت مسلمہ میں شمولیت و اخراج کے اصول و ضوابط کو طے کرنا اور ریاست کے اہداف و آداب کو متعیّن کرنا یہ جماعت اہل علم و مجتھدین کا کام ہے۔ گویا جماعت اہل علم دوسری جماعتوں پر ایک نگران کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ پس الجماعہ کے مصداق آخر یعنی جماعت اہل علم و مجتہدین کی خصوصی حیثیت اور دائمی بقا، دین پر عمل و نفاذ اور اجتہاد کے لیے اس گروہ کی لازمی ضرورت اور امت کے اس گروہ کے محتاج ہونے کے سبب ائمہ کرام نے الجماعہ کا مصداق ہی اس جماعت کو قرار دیا ہے۔

ایک حدیث اگر چہ کمزور صحت کی ہے لیکن اس کا معنی دوسری صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

((الْعلم أفضل من الْعَمَل)) علم، عمل سے افضل ہے۔امام مناوی، شرح جامع الصغیر میں اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: یہ اس لیے کہ علم کی بقاہی میں شریعت کا احیاء اور ملت کے اعلی مقاصد کی تکمیل ہے۔امام بخاری نے صحیح البخاری میں یہ باب باندھا ہے: باب الْعِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ اس کا بیان کہ علم، قول وعمل سے پہلے حاصل کرنا چاہیے۔اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ علم پہلے حاصل کرنا چاہیے اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ علم کا رتبہ علم سے زیادہ ہے۔امام ابن حجران الفاظ کی شرح یوں کرتے ہیں: أَنَّ الْعِلْمَ شَرْطٌ فِي صِحَّةِ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ فَلَا يُعْتَبَرَانِ إِلَّا بِهِ فَهُوَ مُتَقَدِّمٌ عَلَيْهِمَا ''اس لیے کہ علم قول وعمل کی صحت کے لیے شرط کی مانند ہے، علم کے بغیر قول وفعل معتبر نہیں ہوسکتے اسی لیے علم، ان دونوں پر مقدم ہے''، پس علم کی یہی تقدیم ہے جس کی وجہ سے الجماعہ کے مفہوم میں، جماعت علمائے مجتہدین کے مفہوم کو ترجیح دی گئی۔الجماعہ کے ذکر والی ایک دوسری روایت بھی ہے۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا: إِنَّ اللهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّتِي عَلَى ضَلَالَةٍ، وَيَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ (سنن ترمذي) ''بے شک اللہ میری امت کو ضلالت پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا ہاتھ 'الجماعت' پر ہے اور جس نے شذوذ اختیار کیا وہ الگ کر کے دوزخ میں پھینکا جائے گا''۔اس حدیث میں چند باتیں سمجھنے کی ہیں:

ضلالت کا معنی گناہ اور گمراہی وغیرہ بھی ہوتا ہے اور ضلالت کا ایک معنی خطا یعنی چوکنا بھی ہوتا ہے۔جیسے حضرت موسی علیہ السلام نے غلطی سے قبطی کے مارے جانے کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ﴿ فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ﴾ (الشعراء20) اسی لیے مرقاۃ شرح مشکاۃ میں علامہ الابھری کے حوالے سے لکھا گیا ہے: عَلَى ضَلَالَةٍ أَيْ عَلَى خَطَأٍ ''امت ضلالت پر جمع نہیں ہوگی یعنی غلطی پر جمع نہیں ہوگی''۔یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ بعض لوگ اجماع کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ جی ٹھیک ہے امت، گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی لیکن خلوص کے ساتھ غلطی تو ہوسکتی ہے۔حالانکہ حدیث مبارکہ میں اسی اجتماعی یا اجماعی غلطی ہی کی نفی کی گئی ہے۔یہاں اجماع سے مراد، اہل سنت والجماعت کے علمائے مجتہدین کا اجماع ہے۔علامہ مبارکپوری لکھتے ہیں: والمراد إجماع العلماء المجتهدين من أهل السنة والجماعة ''اجماع سے مراد، اہل سنت کے علمائے مجتہدین کا اجماع ہے''۔ملا علی قاری

مرقاۃ میں لکھتے ہیں: فَالْحَدِيثُ يَدُلُّ عَلَى أَنَّ اجْتِمَاعَ الْمُسْلِمِينَ حَقٌّ، وَالْمُرَادُ إِجْمَاعُ الْعُلَمَاءِ، وَلَا عِبْرَةَ بِإِجْمَاعِ الْعَوَامِّ لِأَنَّهُ لَا يَكُونُ عَنْ عِلْمٍ "حدیث یہ دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں کو اجماع حق ہوتا ہے اور اجماع سے مراد، اہل علم کا اجماع ہے اس لیے کہ عوام کسی بات پر اگر جمع ہو بھی جائیں تو علم نہ ہونے کے سبب ان کا اجماع معتبر نہیں ہو گا"۔ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہونے سے، نصرت، حفاظت، غلبے اور اللہ کی رحمت کی طرف اشارہ ہے۔ ملا علی القاری نے اس کی شرح میں یہ بھی لکھا ہے: إِحْسَانُهُ وَتَوْفِيقُهُ لِاسْتِنْبَاطِ الْأَحْكَامِ وَالِاطِّلَاعِ عَلَى مَا كَانَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَصْحَابُهُ مِنَ الِاعْتِقَادِ وَالْعَمَلِ " اس کا معنی یہ بھی ہے کہ انھیں استنباط احکام اور اعتقاد و عمل کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے و منہج کی توفیق دی جاتی ہے اور ان پر اس علم تک رسائی کا احسان کیا جاتا ہے"۔(عَلَى الْجَمَاعَةِ) کی شرح میں لکھا گیا أَيِ: الْمُجْتَمِعِينَ عَلَى الدِّينِ يَحْفَظُهُمُ اللهُ مِنَ الضَّلَالَةِ وَالْخَطَأِ أَوْ لِلتَّوْفِيقِ لِمُوَافَقَةِ إِجْمَاعِ هَذِهِ الْأُمَّةِ " وہ لوگ جو دین پر اس طرح سے جمع ہوں کہ اللہ انھیں گمراہی اور خطا سے بچائے رکھے یا بہ الفاظ دیگر انھیں اس امت کے اجماعی موقف سے موافقت پر قائم رکھے"۔ اس تشریح کو امام بخاری، امام ترمذی اور امام شافعی کے اس قول سے ملا کر دیکھیں کہ الجماعہ سے مراد، جماعت علمائے مجتہدین ہے تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اس حدیث میں الجماعہ سے مراد بھی وہی ہے یعنی جماعت علمائے مجتہدین، اور اس جماعت کی پابندی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ شذوذ، کی وضاحت میں شارحین فرماتے ہیں: انْفَرَدَ عَنِ الْجَمَاعَةِ بِاعْتِقَادٍ أَوْ قَوْلٍ أَوْ فِعْلٍ لَمْ يَكُونُوا عَلَيْهِ "وہ اعتقاد یا قول و فعل اختیار کرنا جس پر وہ نہ ہوں" مطلب یہ کہ جماعت علماء کے اجماع کے خلاف کوئی قول و فعل اختیار کرنا شذوذ ہے۔ چونکہ اس کام پر دوزخ کی وعید وارد ہوئی ہے تو یہ ممنوع اور حرام طرز عمل ہے۔ اس لیے ذاتی زندگی سمیت، دعوتی، تربیتی اور تحریکی میدانوں میں بھی اجماع علمائے امت کی پابندی کرنی چاہیے۔ مطلب یہ کہ معروف معنی میں صرف فقہ و اعتقاد میں ہی نہیں بلکہ منہج و طریق میں بھی علمائے اہل سنت کے اجماعی مواقف کی پابندی کرنی چاہیے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِأَمْرِ اللهِ)) "میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے دین پر قائم رہے گی"۔

'الاعتصام بالکتاب' میں امام بخاری نے اس گروہ کی تعیین ان الفاظ میں کی ہے: وَهُمْ أَهْلُ الْعِلْمِ" اور یہ گروہ اہل علم کا ہے"۔ ملاعلی القاری اس جماعت کے قیام بامر اللہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں، أَيْ بِأَمْرِ دِينِهِ وَأَحْكَامِ شَرِيعَتِهِ مِنْ حِفْظِ الْكِتَابِ وَعِلْمِ السُّنَّةِ وَالِاسْتِنْبَاطِ مِنْهُمَا، وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِهِ، وَالنَّصِيحَةِ لِخَلْقِهِ وَسَائِرِ فُرُوضِ الْكِفَايَةِ" یہ جماعت اللہ تعالیٰ کے دین، احکام شریعت، قرآن پاک اور سنت رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی حفاظت اور ان دونوں شرعی احکام کے استنباط و اجتہاد، جہاد فی سبیل اللہ، مخلوق خدا کی خیر خواہی اور دیگر فروض کفایہ کی ادائی پر قائم رہے گی"۔

تعلیم دین اور استنباط و اجتہاد کے علاوہ، دوسرے کاموں مثلاً دعوت و تبلیغ، جہاد و قتال فی سبیل اللہ، خدمت خلق وغیرہ میں علمائے کرام کی سرپرستی میں چلتے ہوئے بچشم سر دیکھے جاسکتے ہیں اور انہی بابرکت کوششوں سے اسلام کے غلبے کی امید کی جاتی ہے۔

القواعد الفقهية

مفتی نذیر احمد ہاشمی مدظلہ
رئیس شعبہ تحقیق وتصنیف، فقہ اکیڈمی

القاعدة الثانية: العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للألفاظ والمباني

ترجمہ: ''تمام عقود میں مقاصد اور معانی کا اعتبار ہوگا الفاظ اور کلام کی ترکیبی عبارت کا نہ ہوگا''۔

یہ قاعدہ سابقہ قاعدے ''الأمور بمقاصدها'' کی فروع میں سے ہے۔ سب سے پہلے مذکورہ قاعدے کے مفردات کا معنی دیکھتے ہیں:

العبرة: لغوی مفہوم دو ہیں:

(۱) نصیحت اور یاددہانی۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِمَنْ يَخْشَىٰ﴾ (النازعات:۲۶) ترجمہ: ''بے شک اس میں نصیحت ہے، اس کے لیے جو ڈرتا ہے''۔

(۲) الإعتداد بالشيء في ترتب الحكم ''کسی حکم کی ترتیب میں کسی شے کا شمار یا اعتبار کرنا'' یہاں پر دوسرا معنی مراد ہے۔

العقود: عقد کی جمع ہے، جو عقد یعقد باب ضرب سے مصدر ہے۔ اس کا لغوی معانی (الربط) ''جوڑنا'' ہے، یعنی کسی چیز کو دوسری سے جوڑنے کا عمل، جس طرح ایک رسی کو دوسری سے جوڑ دیا جائے جسے گرہ کہتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:
﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ﴾ (الفلق:۴) ''اور گرہوں میں پھونکیں مارنے والیوں کے شر سے''۔

گرہ لگانے سے چونکہ آزادانہ حرکت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اس لیے احتباس اللسان (صدورِ کلام میں زبان کے اٹکنے) کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اللہ عزوجل نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:
﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي﴾ (طہ:۲۷) ''میری زبان کی گرہ کھول دے''

اس کا ایک معنی (الالتزام) ہے۔ قاعدہ زیر مطالعہ میں یہی معنی مراد ہے یعنی کسی قول پر ایسا اتفاق جس سے فریقین پر حقوق و فرائض لازم آجائیں: ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى ----﴾ (البقرۃ:۲۳۵) ’’اور نہ پختہ کرو نکاح کی گرہ (معاہدہ) یہاں تک کہ ۔۔۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (المائدہ:۱) ’’اے اہل ایمان اپنے عقود کو پورا کرو‘‘۔ مندرجہ بالا آیات میں عقدہ یا عقود سے مراد ہے (ما يتعاقد عليه اثنان وما يعاهد ربه) ’’ایسا عقد و معاہدہ جو دو اشخاص کے درمیان طے کیا جائے یا بندے اور اس کے رب کے درمیان طے شدہ ہو‘‘۔

عقد کا اصطلاحی مفہوم: علما نے عقد کی متعدّد تعریفات کی ہیں، جو آپس میں متقارب ہیں:

(۱) ارتباط ارادتين لإنشاء التزام أو نقله أو نهائه. کسی التزام (ذمے داری) کے انشا (ایجاد)، نقل یا اختتام تک پہنچانے کے لیے دو (اشخاص کے) ارادوں کے درمیان ارتباط۔

(الوجيز في شرح القواعد الفقهية في الشريعة الإسلامية لعبد الكريم زيدان، ص:14 بالهامش)

(۲) ارتباط الإيجاب بالقبول. ایجاب کا قبول کے ساتھ جڑنا۔ (التعريفات الفقهية، ص:149)

(۳) ارتباط ايجاب بقبول على وجه مشروع يثبت أثره في محله ’’مشروع طریقے سے ارتباط کہ اس کا اثر محل میں ظاہر ہو جائے‘‘۔ (مجلة الأحكام العدلية، دفعة:153.154) یعنی دو فریقوں کا کسی امر کی بابت اپنی ذات پر ذمے داری لے کر اپنے آپ کو اس کا پابند کر لینا۔ مذکورہ بالا تینوں تعریفات میں تیسری تعریف بنسبت دوسری اور پہلی تعریف کے زیادہ مناسب ہے۔ کیوں کہ اس میں فریقین کے اتفاق اور تعاقد کو لفظِ مشروع کے ساتھ مُقیَّد کیا گیا ہے، جس سے وہ عقود جو شرعًا حرام ہیں، نکل گئے۔

المعاني: معنی کی جمع ہے۔ اور اس کا مفہوم تفسیر و تاویل اور، مرادِ متکلّم ہے۔

اصطلاحی مفہوم: وہ صورۃ ذہنیہ جس پر لفظ دلالت کرتا ہے۔

الألفاظ: لفظ کی جمع ہے، جو لفظ یلفظ باب ضرب سے مصدر ہے۔ اس کا لغوی مفہوم: پھینکنا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾(ق:۱۸)"نہیں نکالتا کوئی بات مگراس کے پاس ہوتا ہے ایک نگران ہوشیار"۔

اصطلاحی مفہوم:الصوت الخارج من الفم حروفا مقطعة "حروف مقطعہ کی صورت میں منہ سے نکلنے والی آواز" یہ مستعمل اور مہمل دونوں کو شامل ہے۔حاصل یہ کہ الفاظ ایسا وسیلہ ہیں،جس کے ذریعے انسان اپنی دلی مراد کو ظاہر کرتا ہے۔

المباني:مبنی کی جمع ہے۔اوراس سے مرادالجملة من الكلام ہے۔

العقود پر الف لام استغراقی ہے۔یعنی عقود کی تمام اقسام میں ان کے معانی مقصودہ کا اعتبار ہو کر ان کے مطابق عمل ہوگا۔الفاظ کا تغیر و تبدل ان کو ان کے مقاصد شرعیہ سے علیحدہ نہ کر سکے گا۔

یہ قاعدہ سابقہ قاعدہ "الأمور بمقاصدها" کو شامل ہے۔کیوں کہ عقود بھی منجملہ ان امور کے ہیں،جن کو انسان روزمرہ کی زندگی میں انجام دیتا رہتا ہے۔اس طرح اس قاعدے کو سابقہ قاعدے کی فرع بھی کہا جاسکتا ہے۔

قاعدۂ مذکورہ کی فروعات اور تطبیقات:

اگر ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ یہ مکان ہر ماہ اتنی رقم کے عوض تمھیں عاریَت پر دیا۔تو اگرچہ عاریت کے لفظ کا معنی اپنی چیز،بلا عوض کسی کے استعمال میں دینا ہے۔لیکن لفظ کے یہ معنی عقد کے مقصد و معنی میں خلل انداز نہ ہوں گے بلکہ فریق دوم کی قبولیت کی صورت میں اسی قول سے عقد اجارہ منعقد ہو جائے گا۔اسی طرح اگر ایک عورت نے کسی کے پیغامِ نکاح دینے پر اس کے جواب میں کہا کہ "میں نے اتنے مال کے عوض اپنا نفس تم پر ہبہ کیا" تو اگرچہ لفظ ہبہ اپنے معنی کے ساتھ اس قول و قرار کے مناسب نہیں ہے لیکن لفظ کا غلط استعمال عقد کے مقصد پہ رکاوٹ نہیں بنے گا اور عقد نکاح منعقد ہو جائے گا۔یا کسی مدیون (قرض لینے والے) نے اپنے دائن (قرض دینے والے) سے اس طرح کہا کہ آپ کا ایک ہزار،روپیہ قرض جو میرے ذمے ہے،اس کے عوض یہ کپڑا میں آپ کو ایک ہزار روپے میں فروخت کرتا ہوں،لیکن شرط یہ ہے کہ جب میں قرض کا ایک ہزار روپیہ آپ کو ادا کروں گا تو یہ کپڑا آپ مجھے واپس کر دیں گے۔اب اس قول میں لفظ فروخت بے محل استعمال ہوا ہے کیونکہ جو صورت بتائی جا رہی ہے وہ رہن کی ہے نہ کہ بیع کی تو لفظ فروخت کے استعمال کے باوجود،دائن کی قبولیت کی صورت میں عقد رہن ہی منعقد ہوگا نہ کہ عقد بیع!!

فقہ اسلامی میں اس قاعدے کی فروع کثرت سے موجود ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے کچھ رقم کے عوض کسی سے کوئی چیز خریدی اور اس کے بعد بائع کو کپڑا دیتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ کپڑا قیمت کی ادائی تک اپنے پاس رکھو تو یہ بائع کے پاس رہن سمجھا جائے گا۔ اگرچہ خریدار نے رہن کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن چونکہ عقود میں معانی کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کا لہذا مشتری کے کلام کے معنی و مقصد کی رعایت کرتے ہوئے عقد مذکور عقد بیع مانا جائے گا۔

بحر الرائق کی کتاب الکفالہ میں ہے کہ حیات (صحت) کی حالت میں وصیت کا لفظ وکالت ہوگی اور وکالت کا لفظ موت کے بعد کے لیے وصیت ہوگا۔ اس لیے کہ قابل لحاظ معانی ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ۔

ہبہ بشرط العوض بیع ہوتا ہے۔ چناں چہ اگر کسی نے دوسرے سے کہا(وهبتك هذا الفرس بمأة دينار) " میں نے یہ گھوڑا سو دینار میں تمھیں ہبہ کیا" اور دوسرے نے قبول کیا تو یہ بیع ہوگی، اگرچہ عبارت میں ہبہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طرح اعارہ بشرط عوض اجارہ ہے۔ چناں چہ اگر کسی نے دوسرے سے کہا(أعرتك سيارتي هذه بخمسين دينارا تستعملها هذا اليوم في صنعاء) " میں آپ کو اپنی یہ گاڑی پچاس دینار، کے عوض عاریتاً دیتا ہوں جس کو آپ آج کے دن صنعا میں استعمال کر سکیں گے" اور دوسرے نے اس پیشکش کو قبول کر لیا تو یہ عقد اجارہ سمجھا جائے گا نہ کہ اعارہ، اگرچہ ایجاب میں لفظ اعارہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

اگر قرض کے کسی معاملے میں 'حوالے' کے لفظ کے ساتھ کوئی عقد کیا جائے لیکن جو شرائط طے کی جائیں تو وہ 'کفالہ' کی ہوں تو باوجود لفظ 'حوالہ' کے استعمال کے، مذکورہ معاملے کو عقد کفالہ قرار دیا جائے گا۔

حوالہ اور کفالہ کی تعریفات: کفالہ کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے: (ضم ذمة إلى ذمة في المطالبة بالدين) دَین (قرض) کے مطالبے میں ایک فرد (مکفول عنہ یعنی وہ مقروض جس کے قرض کی ذمے داری کوئی دوسرا لے رہا ہو) کے ذمے کو دوسرے شخص (یعنی کفیل جو یہ کہے کہ فلاں مقروض کے قرض کے ادا ہونے کی ذمے داری میں اٹھاتا ہوں) کے ذمے سے ملانا۔ اس تعریف کی رو سے کفالہ میں مکفول عنہ کے ذمے سے دَین کفیل کے ذمے کی طرف منتقل نہیں ہوتا بلکہ مکفول عنہ یعنی مقروض پر اپنے قرض کی ادائی کی ذمے داری بدستور عائد رہتی ہے البتہ اس کی اس ذمے داری میں کفیل بھی شریک ہو جاتا ہے۔

’حوالہ‘کی تعریف یوں کی جاتی ہے:(نقل دین من ذمة إلی ذمة)”کسی قرض کا ایک شخص (یعنی مقروض، مُحیل) کے ذمے سے کسی تیسرے شخص (یعنی محال علیہ) کی جانب منتقل ہوجانا“ حوالے کے معاملے میں تین فریق ہوتے ہیں۔ ایک مقروض و مدیون جسے مُحیل کہتے ہیں جو اپنے قرض کی ادائی دوسرے کے حوالے کرتا ہے۔ دوسرا فریق محال علیہ یا محتال علیہ، قرض لوٹانے کی ذمے داری جس کو سونپی جاتی ہے۔ تیسرا فریق، صاحب حق یعنی دائن ہوتا ہے جو مُحال یا محتال کہلاتا ہے۔ عقدِ حوالہ ان تینوں فریقین کی رضامندی سے منعقد ہوتا ہے۔ عقد حوالہ کے انعقاد کے بعد مُحیل ادائی قرض سے بری الذمہ ہوجاتا ہے، کیونکہ عقود میں اعتبار، لفظ کا نہیں بلکہ مقصد و معانی کا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر مدیون نے دائن سے کہا(أحلتك بما لك من دين بذمتي ومقداره كذا على فلان، على أن تبقي ذمتي مشغولة بدينك علي، حتى يدفع لك المحال عليه الدين)”میرے ذمے اتنی اتنی مقدار کا جو تمھارا دَین ہے وہ میں نے فلاں کے حوالے کردیا، اس شرط پر کہ جب تک محال علیہ دَین کی رقم تمھارے حوالے نہ کرے، اس وقت تک تمھارا دَین بدستور میرے ذمے رہے گا“ ۔ اب اگر تمام فریق اس عقد پر اپنی رضامندی ظاہر کردیں تو عقد منعقد تو ہوجائے گا لیکن یہ عقد کفالہ ہوگا نہ کہ عقد حوالہ۔ کیوں کہ عقدِ مذکور میں اگرچہ لفظ حوالے کا استعمال ہوا ہے لیکن بیان کردہ شرط میں محیل (مقروض) کے ذمے سے دین محال علیہ کے ذمے کی طرف اس طرح منتقل نہیں ہوا کہ محیل بری الذمہ ہو جاتا، جیساکہ عقد حوالہ میں ہوتا ہے بلکہ محیل بدستور ادائی قرض کا ’ شریک مکلف ‘رہا اور شراکت ذمہ کفالہ کی شرط ہے لہذا لفظ حوالہ سے قطع نظر عقد کے مقصد و معنی کا لحاظ کرتے ہوئے عقد مذکورہ کو عقد کفالہ قرار دیا جائے گا اور اسی کے احکام فریقین پر جاری ہوں گے۔

ایک شخص نے دوسرے پر مثلاً کسی سامان کا دعوی کیا۔ مدعی علیہ نے مدعی کے دعوے کو درست تسلیم کرتے ہوئے سامان کے عوض کچھ مال دے کر مدعی سے صلح کرنا چاہی پھر معاہدے کے وقت کہا گیا کہ ہم فلاں فلاں معاملے میں اتنی رقم کے عوض باہم صلح کرتے ہیں تو فریقین کی رضامندی سے یہ عقد منعقد ہوجائے گا لیکن یہ عقد صلح نہیں بلکہ عقد بیع گردانا جائے گا، قطع نظر اس کے کہ عقد میں لفظ صلح استعمال ہورہا ہے۔ اس لیے کہ مدعی علیہ، دعوے کو مان کر یہ تسلیم کررہا ہے کہ مدعی کا سامان میری تحویل میں ہے اور مال غیر کا عوض اس کی قیمت کہلاتا ہے اس لیے یہ معنوی اعتبار

سے بیع ہے اور بیع کے احکام مثلا شفعہ اور عیب کی صورت میں واپسی کا حق وغیرہ اس عقد پر جاری ہوں گے۔

ایک شخص نے اپنے مکان کی آمدنی کے سلسلے میں یہ وصیت کی کہ وہ دائمی طور پر مساکین پر صرف کی جائے یا اولاً فلاں شخص پر بعدہ دائماً مساکین پر، تو یہ مکان ضرورتاً وقف سمجھا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سابق طرز کلام کا معنی یہ ہے کہ میں نے اپنے مرنے کے بعد فلاں مصرف پر یہ مکان وقف کیا، لیکن چوں کہ یہ وقت موت پر معلق کیا گیا ہے، اس لیے تہائی مال میں نافذ ہوگا۔ اگر کسی شخص نے کہا کہ میرے اس مکان کی آمدنی میں سے ہر ماہ دس روپے کی روئی خرید کر مساکین میں تقسیم کی جایا کرے تو یہ مکان وقف ہوگا۔ ردالمحتار میں ہے کہ اس کلام کا مقتضی یہ ہے کہ پورا مکان اگر اس شخص کے مال کی ایک تہائی قرار پاتا ہے تو کل مکان وقف ہوجائے گا۔ اگرچہ اس شخص نے یہ کہا ہے "مکان کی آمدنی سے" اور یہ عبارت چاہتی ہے کہ آمدنی کا کچھ حصہ مساکین کے استعمال میں آئے، لیکن چوں کہ اعتبار مقاصد و معانی کا ہوتا ہے، نہ کہ الفاظ کا تو اس لیے پورا مکان وقف ہوگا۔

اردو لکھنے والوں سے چند گزارشات

حافظ حماد احمد ترک، نائب ناظم شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

اس مضمون میں ہم اردو املا سے متعلق چند اہم اور بکثرت استعمال ہونے والے الفاظ پر بحث کریں گے جنھیں عموماً غلط املا سے لکھا جاتا ہے۔ املا کے ضمن میں جو اہم ترین اور بنیادی اصول ہے، اگر وہ پیشِ نظر رہے تو اغلاط کی شرح نہایت کم ہوجاتی ہے۔ استاذ محترم، ماہرِ لسانیات، ڈائریکٹر جنرل ادارہ فروغِ قومی زبان ڈاکٹر عبد الرؤف پاریکھ صاحب سے ہی یہ اصول سیکھا تھا کہ ''جو لفظ جیسے بولتے ہیں ویسے ہی لکھیں گے''۔ چنانچہ اس اصول کے تحت ہم کچھ الفاظ ذکر کرتے ہیں:

ا)''ہ'' اور ''ھ'' میں غلطی:

اردو میں ہاے حطی (ح) کے علاوہ، ہاے ہَوَز، اور ہاے مخلوط (ھ) بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ہاے مخلوط (ھ) کسی دوسرے حرف کے ساتھ مل کر اس حرف کی معروف آواز میں تغیر کا باعث بنتی ہے، یعنی یہ (ت) کے ساتھ مل کر اسے (تھ) تھے بنا دیتی ہے۔ جبکہ ہاے ہوز، وہاں استعمال ہوتی ہے جہاں (ہا) کی آواز دوسرے حرف میں مدغم نہ ہو بلکہ الگ سے سنائی دے۔ پس لکھتے وقت خیال رکھنا چاہیے کہ ہاے ہوز اور ہاے مخلوط ایک دوسرے کی جگہ استعمال نہ ہوں۔ ذیل کی مثالوں پر غور کرنے سے بات واضح ہوجائے گی:

(پانی کا) بہاؤ، ہاے ہوز سے لکھا جائے گا اس لیے کہ اس میں (ہا) کسی دوسرے حرف کے ساتھ مدغم نہیں ہو رہی اور (آٹے دال کا) بھاؤ، ہاے مخلوط سے لکھا جائے گا اس لیے کہ یہاں (ہا) بے کے ساتھ مدغم ہو رہی ہے۔

کہو اور کھو، بہلانا اور بُھلانا، پَہَر اور پھِر، اور اس طرح کے بہت سے ملتے جلتے الفاظ ہیں جن میں (ہا) کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ اگر ان الفاظ کا املا غلط لکھا تو معنی کچھ سے کچھ ہوجائے گا جیسے ہم کہیں کہ ''اس پانی کا 'بھاؤ' کتنا ہے'' ''دال مسور کا بہاؤ کیا ہے'' یا ''تم نے میرا قلم 'کہو' دیا'' یا ''ماں اپنے بچے کو 'بھلاتی' رہی''۔ تو مفہوم بالکل ہی بدل گیا۔ اسی طرح درج ذیل الفاظ میں بھی (ہا) کی غلطی عام پائی جاتی ہے۔ یعنی یہ عموماً ''ھ'' کے بجائے ''ہ'' سے لکھے جاتے ہیں

جبکہ ان کا درست املا یوں ہے: تمھیں، تمھارا، جنھیں، جنھوں، انھیں، انھوں۔ واضح رہے کہ ہم بولتے وقت ان تمام الفاظ کو "ھ" کے ساتھ ادا کرتے ہیں یعنی "تُم ہیں" نہیں بلکہ "تُ مھیں" بولتے ہیں۔ تو چونکہ لفظ کا املا اس کے تلفظ کے مطابق ہونا چاہیے یعنی لفظ جیسے بولا جائے اسے اسی طرح لکھنا چاہیے لہذا، مندرجہ بالا الفاظ "ھ" (ہائے مخلوط) کے ساتھ لکھے جانے چاہیے۔ اب ہم ان الفاظ کے تلفظ کو وزن شعری سے ثابت کرتے ہیں:

خموشیوں کی صدائیں بلا رہی ہیں تمھیں   یہ وادیاں یہ فضائیں بلا رہی ہیں تمھیں

ساحؔر کا یہ شعر بحرِ مجتث مثمن مخبون محذوف میں ہے یعنی "مفاعِلُن فَعِلاتُن مفاعِلُن فَعِلُن"۔ اگر یہاں تمہیں (تم ہیں) پڑھا جائے تو شعر بحر سے خارج ہو جائے گا۔۔۔ کیسے؟ آخری حصے کی تقطیع دیکھیے!

صحیح = بلا (مفا) رہی (علن) ہیں تُ (فعِ) مھیں (لُن)

غلط = بلا (مفا) رہی (علن) ہیں (مف) تم (عو) ہیں (لُن) اور یہ کوئی بحر ہے ہی نہیں۔

اگرچہ بات پیچیدہ ہو گئی لیکن ذرا سی توجہ سے واضح ہو جائے گا کہ 'تمہیں' غلط املا ہے۔ چند مزید اشعار ذکر تے ہیں:

تم کو جہان شوق و تمنا میں کیا ملا   ہم بھی ملے تو درہم و برہم ملے تمھیں

جونؔ ایلیا کے اس شعر کا وزْن (نہ کہ وزَن) ہے "مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن"، نتیجہ خود نکال لیجیے۔ جونؔ کا یہ شعر دیکھیے:

تمھارا ہجر منالوں اگر اجازت ہو   میں دل کسی سے لگالوں اگر اجازت ہو

احمد مشتاق کا یہ شعر دیکھیے:

کیسے انھیں بھلاؤں محبت جنھوں نے کی   مجھ کو تو وہ بھی یاد ہیں نفرت جنھوں نے کی

یہ شعر بحر مضارع یعنی "مفعول فاعلات مفاعیل فاعِلن" میں ہے۔ انہیں (اُن ہیں) اور جنہوں (جِن ہوں) پڑھ کر دیکھیے، آپ خود کہہ اٹھیں گے کہ درست "ھ" سے ہے۔

ہائے مخلوط کسی لفظ کے شروع میں نہیں آتی، جہاں بھی کسی لفظ کے شروع میں (ہا) آئے گی وہ ہائے ہوز ہی ہوگی چنانچہ 'ہاتھی' کو 'ھاتھی'، 'ہا' کو 'ھا'، 'ہائے' کو 'ھائے'، 'ہمت' کو 'ھمت' لکھنا درست نہ ہوگا۔

ایک اہم معاملہ ''ء'' کا ہے۔ وہ عربی الفاظ جو ''فُعَلاء'' کے وزن پر آتے ہیں جیسے عُلماء، شعراء وغیرہ، انھیں ہم علما اور شعرا بولتے ہیں، جیسے ''وہاں شعرا کی مجلس تھی''، آپ اس جملے کو ادا کرتے وقت شعرا کے آخر میں ہمزہ نہیں ادا کرتے، چنانچہ ہمزہ لکھا بھی نہیں جائے گا۔ البتہ اگر کسی نام کو درج کیا جائے جیسے ''ندوۃ العلماء'' یا پھر کوئی عربی ترکیب ذکر کی جائے تو ہمزہ لکھا جائے گا جیسے ''سید الشہداء''۔

اسی طرح عربی کے وہ دیگر الفاظ جن کے آخر میں ہمزہ ہے۔ اردو میں بدون ہمزہ لکھے جائیں گے جیسے ابتدا، انتہا، آرا (رائے کی جمع)، اشتہا، ارتقا، عشا، غذا، غنا، شفا وغیرہ۔ اس املا کے درست ہونے پر اساتذہ کا کلام شاہد ہے۔ جون ایلیا کا شعر ہے:

اب ببر شیر اشتہا ہے میری　　　شاعروں کو تو کھا چکا ہوں میں

اور علامہ اقبالؔ کا شعر:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں　　　مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

اصول: ہائے مختفی صرف عربی فارسی الفاظ میں آئے گی جیسے دریچہ، پروانہ، غنچہ، عمرہ، خزانہ، وغیرہ:

چنانچہ بھروسا، ٹھیکا، دھوکا، راجا، مہینا اور دیگر ہندی یا سنسکرت سے آئے الفاظ الف سے ہی لکھے جائیں گے۔ البتہ جگہوں کے نام جو ''ہ'' سے لکھے جاتے ہوں جیسے آگرہ، لاڑکانہ، افریقہ، کوئٹہ، یا وہ الفاظ جو عربی فارسی کے نہ ہوں لیکن ''ہ'' سے رائج ہو چکے ہوں جیسے پکوڑہ، سموسہ، انھیں ''ہ'' سے ہی لکھا جائے گا۔

ان الفاظ کو لکھتے وقت امالے کا قاعدہ برتا جائے گا یعنی املا میں تلفظ کا اتباع ضروری ہو گا جیسے یہاں ایک دریچہ ہے، میں دریچے میں گیا (دریچہ میں گیا غلط ہے)۔ اسی طرح میری ذِمے داری ہے نہ کہ ذمہ داری۔

اصول: اردو میں اسمِ صفت یا اسمِ کیفیت بناتے وقت الفاظ کے آخر میں '' ی'' کا اضافہ کرتے ہیں۔ اس میں اصول یہ ہے کہ جن الفاظ میں ہائے مختفی ہو صرف ان کے اسمِ صفت یا اسمِ کیفیت میں '' ی'' کے ساتھ '' گ'' کا اضافہ کریں گے جیسے دیوانہ سے دیوانگی، روانہ سے روانگی، بیگانہ سے بیگانگی، مردانہ سے مردانگی۔ اس کے علاوہ تمام الفاظ کے آخر میں صرف '' ی'' کا اضافہ ہو گا چنانچہ جدا سے جدائی ہو گا جدائیگی نہیں، ادا سے ادائی ہو گا ادائیگی نہیں، درست سے

درستی ہوگا درستگی نہیں، ناراض سے ناراضی ہوگا ناراضگی نہیں۔

درج ذیل الفاظ بھی عموماً غلط املا سے لکھے جاتے ہیں:

منہ غلط/منھ درست، مہندی(م ہ ن د ی)غلط/منہدی(م ن ہ د ی) درست، مینہ(بارش)غلط/مینھ درست، مصرعہ غلط/مصرع درست، موقعہ غلط/موقع درست، معہ غلط/مع درست، سن ۲۰۲۰ء غلط/سنہ ۲۰۲۰ء درست۔(سنہ کا مطلب سال اور سِن کا مطلب عمر)، دئے، کئے، لئے، کیجئے، دیجئے، لیجئے، کیجیئے، بولئے، پوچھئے غلط/دیے، کیے، لیے، کیجیے، دیجیے، لیجیے، بولیے، پوچھیے درست، چھ(٦)غلط/چھے درست۔

دو لفظوں میں اضافت

جس طرح عربی میں اضافت کے لیے قاعدہ موجود ہے اسی طرح اردو اور فارسی میں بھی ہے۔فارسی میں تین حروفِ اضافت ہیں، ان تین حروفِ اضافت میں سے کوئی بھی ایک حرف دو لفظوں کے مابین آکر مرکبِ اضافی بناتا ہے، تین حروف یہ ہیں:

ء، ے، ـِ(ہمزہ، بڑی یا اور زیر)۔جس طرح اردو میں حروف اضافت استعمال کرتے وقت ایک ہی حرف استعمال ہوتا ہے یعنی: یہ احمد کی کتاب ہے۔کی حرفِ اضافت ہے، جب ایک حرف آگیا تو اس کے ساتھ دوسرا حرف لکھنا بیوقوفی ہے جیسے: یہ احمد کی کے کتاب ہے، کی اور کے دونوں کا بیک وقت استعمال غلط ہے اسی طرح فارسی کے حروفِ اضافت میں سے بیک وقت ایک حرف استعمال ہوگا، یعنی ہمزہ آئے گا، یا زیر آئے گا یا پھر یا آئے گی۔

ہمزہ/ء

اگر مضاف کے آخر میں "ہ" ہو یا "ی" ہو تو اضافت کے لیے ہمزہ لگائیں گے (صرف ہمزہ)، مثلاً:

شعبۂ اردو، حوالۂ بالا، درجۂ اول، خواجۂ خواجگان قطرۂ دریا، خلاصۂ قرآن، طلبۂ علم (طلبا کے بجائے طلبہ لکھنا درست ہے)۔چنانچہ شعبۂِ اردو غلط، قطرۂِ دریا غلط ہوگا دو حروفِ اضافت آنے کی وجہ سے۔

زندگیٔ من، خوشیٔ دوست، گرانیٔ طبع۔

بڑی یا/ے

اگر مضاف کے آخر میں الف ہو تو اضافت بڑی یا سے ہوگی، مثلاً:

علمائے کِرام، شعرائے کراچی، دریائے سندھ، گُل ہائے رنگارنگ، ابتدائے عشق، انتہائے سحر وغیرہ۔ چنانچہ علمائے کرام، فقہائے عظام، انتہائے سحر غلط ہوگا۔ اس لیے کہ اس میں دو علامات اضافت جمع ہو رہی ہیں۔ غالب نے لکھا ہے کہ بوقتِ اضافت بڑی یا پر ہمزہ لگانا عقل کو گالی دینا ہے (جیسے بیک وقت کا اور کے کا استعمال حماقت ہے)۔ ہمارے استاذ ڈاکٹر **عبدالرؤف پاریکھ** صاحب دورانِ تدریس یہ قاعدہ بتانے کے بعد ازراہِ تفنن، طلبہ سے فرماتے "تم لوگ یا پر ہمزہ لگاؤ اور اپنی عقلوں کو گالی دو"!!

زیر/ِ

درج بالا دو قواعد کے سوا تمام جگہ اضافت زیر سے ہوگی:

پیشِ نظر، شہرِ کراچی، عشقِ نبی ﷺ، محبوبِ حقیقی وغیرہ۔

نوٹ: پسِ منظر غلط اور پس منظر درست ہے۔ یہ اصل میں منظرِ پس تھا جسے پس منظر کر دیا گیا۔

اہم بات

ایک اہم بات جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے، وہ یہ کہ جس زبان میں بھی عبارت لکھی جائے اس زبان کے قواعد کے مطابق لکھی جائے، مثلاً اگر ہم اپنے مضمون میں عربی عبارت لکھتے ہیں تو اس بات کا خیال رکھیں کہ کہاں یا کے نیچے نقطے آئیں گے کہاں نہیں! کہاں الف کے اوپر ہمزہ آئے گا، کہاں نیچے آئے گا، کہاں ہمزہ نہیں آئے گا وغیرہ، یہی معاملہ فارسی، انگریزی، سندھی، پشتو اور دیگر زبانوں کا ہے کہ ان زبانوں کی عبارتیں ان کے مروجہ رسم الخط میں لکھی جائیں اور لکھتے وقت ان کے قواعد کی رعایت کی جائے۔

دارالافتاء فقہ اکیڈمی

شوال کے چھے روزے

سوال: السلام علیکم! شوال کے چھے روزوں کا کیا حکم ہے؟ ایک مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ شوال کے چھے روزوں کی احادیث کی صحت کا تین بڑے اماموں نے (امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام بخاری رحمہم اللہ نے) انکار کیا ہے، اسی طرح محقق علی الاطلاق علامہ ابن ہمام اور علامہ ابن نجیم شارح کنزالدقائق رحمہما اللہ نے ان روزوں کو ناجائز روزوں میں شمار کیا ہے۔

شوال کے چھے روزے مستحب ہیں ان کا رکھنا باعث ثواب ہے اور ان کو مکروہ سمجھنا درست نہیں۔ حدیث شریف میں ہے: عن أبي أیوب عن رسول اللہ ﷺ قال: من صام رمضان ثم أتبعه ستامن شوال فذاک صیام الدهر''. (رواہ الجماعة إلاالبخاري والنسائي) ترجمہ: ''جس نے رمضان کے روزے رکھے اور پھر شوال کے چھے روزے رکھے تو یہ ہمیشہ (یعنی پورے سال) کے روزے شمار ہوں گے''۔ اس حدیث کو امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ سب نے صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، فقہ حنفی کی معتبر کتابوں نے بھی ان روزوں کو مستحب اور سنت قرار دیا ہے، چنانچہ الدر المختار میں ہے: (وندب تفریق صوم الست من شوال) ولایکرہ التتابع علی المختار خلافا للثاني حاوي والأتباع المکروہ أن یصوم الفطر وخمسة بعدہ فلو أفطر الفطر لم یکرہ بل یستحب ویسن- ابن کمال

علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے بھی ''الدرالمختار'' کی مذکورہ عبارت کی تشریح کرتے ہوئے مختلف کتابوں کے حوالہ سے حنفی مذہب میں راجح اور مختار قول کے مطابق ان روزوں کو ثابت کر دیا ہے۔ اور اخیر میں علامہ قاسم ابن قطلوبغا کے ایک رسالے کا حوالہ دیتے ہوئے، جن لوگوں نے ان روزوں کی مطلقاً کراہت کو امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کیا ہے ان لوگوں کے دعوے کو جھوٹا اور بلا دلیل قرار دیا ہے۔ وتمام ذلک في رسالة ''تحریر الأقوال في صوم الست من شوال'' للعلامة قاسم وقد رد فیھاعلی مافی منظومة التباني وشرحامن عزوہ الکراھة مطلق إلی أبي حنیفة وأنه

الاصح بأنه على غير رواية الأصول و أنه صحح مالم يسبقه أحد إلى تصحيحه و أنه صحح الضعيف و عمد إلى تعطيل مافيه الثواب الجزيل بدعوى كاذبة بلادليل ثم ساق كثيرا من نصوص كتب المذهب فراجعافاهم

سوال میں جتنی کتابوں کا ذکر فرمایا گیا ہے ان تمام کتابوں میں کراہت کے قول کو نقل فرما کر عامۃ المشائخ کے جواز کا قول بھی ذکر کیا گیا ہے اور جو کراہت ہے اس کے بارے میں علامہ کاسانی فرماتے ہیں کہ کراہت صرف اس صورت میں ہے جبکہ عید کے دن کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے اور عید کے دن روزہ رکھ کر باقی پانچ دن روزہ رکھا جائے لیکن اگر عید کے دن روزہ نہ رکھا جائے تو اس میں کراہت بھی نہیں۔والأتباع المكروه هو أن يصوم يوم الفطر ويصوم بعده خمسة أيام فأما إذا أفطر يوم العيد ثم صام بعده ستة أيام فليس بمكروه بل هو مستحب وسنة-امام مالک رحمہ اللہ ان روزوں کو ناجائز یا مکروہ نہیں فرماتے بلکہ ان روزوں کو فرض سمجھنے سے منع فرماتے ہیں چنانچہ فقہ مالکی کی مشہور کتاب الاستذکار میں ہے:"امام مالک کے ہاں یہ روزے مکروہ نہیں ہوں گے ان شاء اللہ کیونکہ روزہ ڈھال ہے اور اللہ تعالی کے لیے کھانے پینے اور اپنی شہوات کو چھوڑ دینے کی فضیلت معلوم ہے اور یہ خیر اور نیکی کا کام ہے اور امام مالک رحمہ اللہ ان تمام چیزوں سے ناواقف نہیں تھے اور انہوں نے ان روزوں کو ان فضائل کی بنیاد پر مکروہ نہیں کہا بلکہ ناواقف لوگوں کے خوف سے کہ وہ ان کی متابعت کر کے ان کو رمضان کے روزوں میں شمار نہ کرنے لگیں"۔اور امام بخاری رحمہ اللہ کا ان روزوں کی فضیلت پر مشتمل حدیث کا اپنی صحیح میں ذکر نہ کرنا اس سے انکار پر دلالت نہیں کرتا بلکہ ممکن ہے کہ ان کی متعیّن کردہ شرائط کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے اس کہ تخریج نہ فرمائی ہو کیونکہ گزشتہ سطور میں یہ بات ذکر کی جاچکی ہے کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔لہذا شوال کے ان روزوں کو مطلقا مکروہ سمجھنا درست نہیں، جبکہ سلف صالحین کے ہاں ان روزوں کے رکھنے کا معمول بھی چلا آرہا ہے۔اس لیے صحت وقدرت ہو تو ان روزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ(۱)

تعارف وتشریح: حماد احمد ترک

پھر کے گلی گلی تباہ، ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں
دل کو جو عقل دے خدا، تیری گلی سے جائے کیوں
رخصتِ قافلہ کا شور، غش سے ہمیں اٹھائے کیوں
سوتے ہیں اُن کے سائے میں، کوئی ہمیں جگائے کیوں
بار نہ تھے حبیب کو، پالتے ہی غریب کو
روئیں جو اب نصیب کو، چین کہو گنوائے کیوں
یادِ حضور کی قسم، غفلتِ عیش ہے ستم
خوب ہیں قیدِ غم میں ہم، کوئی ہمیں چھڑائے کیوں

---

(۱) آپ کی ولادت ۱۸۵۶ء میں ہندوستان کے مشہور شہر بریلی میں ہوئی۔ بقول مولانا ابوالحسن علی الندوی: ”آپ نہایت کثیر المطالعہ، وسیع المعلومات اور متبحر عالم تھے، رواں دواں قلم کے مالک اور تصنیف و تالیف میں جامع فکر کے حامل تھے“۔ عابدؔ نظامی لکھتے ہیں: ”یہ کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں، بلکہ عینِ حقیقت ہے، ان کے اشعار پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فصاحت وبلاغت، حلاوت و ملاحت، لطافت ونزاکت یہ سب ان کے ہاں کی لونڈیاں ہیں“۔ بقول شان الحق حقی: ”میرے نزدیک مولانا کا نعتیہ کلام ادبی تنقید سے مبرا ہے۔ اس پر کسی ادبی تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی مقبولیت اور دلپذیری ہی اس کا سب سے بڑا ادبی کمال اور مولانا کے مرتبے پر دال ہے“۔ کوثرؔ نیازی نے آپ کو نعت کا امام قرار دیا۔ آپ کا دیوان ”حدائقِ بخشش“ کے نام سے شائع ہوا۔ پیشِ کردہ نعت مرزا غالبؔ کی زمین میں کہی گئی ہے:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیکھ کے حضرتِ غنی، پھیل پڑے فقیر بھی
چھائی ہے اب تو چھاؤنی، حشر ہی آنہ جائے کیوں

یعنی نبی اکرم ﷺ کی کرمافرمائی اور جود و سخا سے فیض پاکر، آپ کے غلاموں نے وہاں سے تا حشر نہ جانے کا تہیہ کرلیا۔

جان ہے عشقِ مصطفٰی، روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ، نازِ دوا اٹھائے کیوں
اب تو نہ روک اے غنی عادتِ سگ بگڑ گئی
میرے کریم پہلے ہی لقمۂ تر کھلائے کیوں
سنگِ درِ حضور سے ہم کو خدا نہ صبر دے
جانا ہے سر کو جاچکے، دل کو قرار آئے کیوں
ہے تو رضا نِرا ستم، جرم پہ گر لجائیں ہم
کوئی بجائے سوزِ غم سازِ طرب بجائے کیوں

لَجانا یعنی شرمندہ ہونا۔ جرم سے مراد محبوب کا در چھوڑنا۔ دوسرے مصرعے میں پہلا ''بجائے'' سے مراد ہے ''کی جگہ'' اور دوسرا ''بجائے'' سے مراد وقتِ رخصت قافلے کی روانگی کے لیے گھنٹی بجانا، قافلے کی گھنٹی کو سازِ طرب قرار دیا کہ ساز عموماً خوشی کے وقت بجایا جاتا ہے اور گھنٹی کی آواز بھی ایک طرح کا ساز ہے۔ مفہوم شعر کا یہ ہوا کہ ہم محبوب ﷺ کو چھوڑ کر واپس جارہے ہیں اور ہم اپنے اس جرم پر شرمندہ ہیں، اس جدائی پر چاہیے تو یہ تھا کہ سوزِ غم منایا جاتا، سازِ طرب کیوں بجایا جارہا ہے، لفظ ''بجائے'' کے استعمال نے شعر کی خوبصورتی کو چار چاند لگادیے ہیں۔ اسے صنعتِ تجنیس بھی کہا جاتا ہے۔